REGISTERED BY

GOVERNMENT OF INDIA

HUSAN-KI-MALIKAH

PRICE ONE RUPEE FOUR ANNAS

APPLY TO :—

Price Re. 1

Fazal Book Depot

Fazal Manzil No. 27, LAHORE.

جاسوسی کا سنسنی خیز ناول

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

جاسوسی کا سنسنی خیز ناول

حُسن کی ملکہ

مصنفہ محمد عبدالسلام صاحب قریشی عابد

یہ ناول نہایت ہی حیرت انگیز عبرت خیز ہے۔ جسمیں عیاروں
کی عیاریاں معشوقانہ سچی اُلفت کی رازداریاں دشمنوں
کی ریشہ دوانیاں کچھہ ایسے طریقہ سے سپرد قلم کی گئی ہیں
کہ اہل دل پڑھکر حیران رہ جاتے ہیں

حسب فرمائش
منشی فضل الدین فضل کریم
تاجران کتب و مالکان
دی نیو ناول ہوس فضل منزل ۲۷ لاہور

سائن بورڈ مفت دیئے جاتے ہیں
زیادہ
سائن بورڈ مفت دیئے جاتے ہیں
مال کے خریدار
بذریعہ
خط وکتابت فیصلہ کریں
منشی فضل الدین فضل کریم
اشتہار مفت بھیجے جاتے ہیں
تاجران کتب
اشتہار مفت بھیجے جاتے ہیں
فضل بکڈپو فضل منزل ۲۷ لاہور

۷۸۶

حُسن کی ملکہ

آغاز عشق

ماہ اگست ۱۹۲۲ء کی اکیسویں تاریخ ہے۔ قریباً ساڑھے گیارہ کا وقت ہے۔ آفتاب عالمتاب خط استوا کے نزدیک ہے۔ اسی وقت کو دوپہر کے نام سے مرقوم کیا جاتا ہے۔

آج گرمی اس شدت کی ہے۔ کہ الامان پرندے بیچارے مارے پیاس کے ہلکان ہو رہے ہیں۔ غریب بوجہ گرمی اتنی طاقت پرواز نہیں رکھتے۔ کہ جا کر ایک آدھ گھونٹ پانی کا خشک حلق کے نیچے اُتاریں۔ حالت تلخی میں درختوں پر پتوں کی آڑ میں چونچیں کھولے لمبے لمبے سانس لے رہے ہیں۔

رہرو مسافر بیچارے آفت کے مارے مسافت طے کرنے سے مجبور ہیں۔ ہاں ان مصیبت زدہ مسافروں کے جو چاہ یار میں اشکبار دیار محبوب کو سر اور پاؤں سے ننگے جا رہے ہیں۔ کوئی اس گرمی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اس گرمی کو اپنی آتش عشق اور اس گرم و تند ہوا کو اپنی آہ سوزاں تصور کئے ہوئے ہیں۔

ٹھیک اس وقت ایک نوجوان بیس یا کیس سالہ ایک نہایت ہی عالیشان قصر سے برآمد ہوا۔ جو قصر کہ غالباً ریلوے آفس ہے۔

خیر یہ نوجوان گرمی سے گھبرایا ہوا اس سڑک پر چلنے لگا۔ جو کہ لاہور اسٹیشن کو جاتی ہے۔

اس وقت نوجوان کی عجب حالت ہے۔ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہے جس سے حواس باختہ ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی درخت راہ میں مل گیا۔ تو صرف ایک منٹ کے لئے ٹھہر گیا۔ ورنہ چلا ہی جارہا ہے۔

گو یہ نوجوان شدّت دھوپ سے حیران و پریشان ہے۔ مگر خدا جانے کس کے اشتیاق میں نہایت تیزی سے چلا جارہا ہے۔

خیر بدقت دشوار اس سڑک کو طے کیا۔ اور لاہور اسٹیشن میں گھس گیا۔ بارے قدرے طبیعت کو چین ملا۔ سر سے ٹوپی اتار کر رومال سے پسینہ پونچھا۔ اور مسلم ہوٹل کا راستہ لیا۔ جو کہ نمبر ۴ اور نمبر ۵ پلیٹ فارم کے درمیان واقع ہے۔

نوجوان ہوٹل میں گھستے ہی ایک نہایت ہی پُر تکلف کرسی جس پر کہ مخمل آویزاں تھی۔ جا بیٹھا۔ اور ٹوپی کوٹ اتار کر نوکر کے حوالے کیا۔ جنکو اس نے سامنے کھونٹی پر لٹکا دیا۔ اور خود باادب سر جھکا کر آن کھڑا ہوا۔ نوجوان نے اسکو دیکھتے ہی کہا۔ کہ جاؤ پائن ایپل کی بوتل لاؤ۔ مگر دیکھو برف خوب پیس کر ڈالنا۔

ملازم۔ (سر اور کمر کو خوب جھکا کر) بہت بہتر۔ حضور۔ کیا علاوہ بوتل کے سگرٹ بھی لیتا آؤں۔

نوجوان۔ نہیں ہم سگریٹ وگریٹ نہیں پیا کرتے۔

یہ سنتے ہی ملازم گیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ایک گلاس جسمیں کہ پیلے رنگ کا پانی تھا۔ نوجوان کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ . . . . جسے نوجوان نے نہایت ہی تکلف سے ایک ایک گھونٹ کر کے پینا شروع کیا۔ اور ملازم خود دست بستہ خدمتِ نوجوان میں حاضر رہا۔

جب اس زندہ دل نوجوان نے فراغت پائی۔ تو جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ اور ملازم ہوٹل کے حوالے کیا۔ جسے وہ لیکر مالک ہوٹل کے پاس گیا۔ اس نے جو کاٹنا تھا۔ کاٹا۔ باقی نو روپے اور کچھ پیسے طشتری میں رکھکر ملازم کے حوالے کیا۔ جسے وہ لیکر ہمارے زندہ دل نوجوان کے پاس لایا۔

نوجوان نے نو روپے تو پلیٹ سے اٹھا لئے۔ باقی جسقدر رقم تھی پلیٹ ہی میں رہنے دی۔ اور خود جاکر نمبر ۵ پلیٹ فارم کا چکر لگانے لگا۔

یہ اپنے خیالوں میں محو ادہر اُدہر پھر رہا تھا۔ کہ کسی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو نوجوان نے پلٹکر دیکھا۔ تو ایک نہایت ہی معزز شخص جن کے بُشرے سے امارت کے علامات ہویدا تھے۔ دیکھتے ہی فوراً پہچانا اور کہا۔

نوجوان ۔ آخاہ سیّد صاحب۔ اداب عرض ہے جناب۔

سیّد صاحب ۔ خوش رہو بیٹا۔ عمر دراز ہو۔ کہو بھائی افتخار احمد کے لینے کو آئے ہو۔

نوجوان ۔ حضور بیشک اُنہی کی قدم بوسی کی خاطر آیا ہوں۔

سیّد صاحب ۔ اچھا تو چلو وہاں (بنچ کی طرف اشارہ کرکے) چل کر بیٹھیں۔ ابھی گاڑی کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

نوجوان چلیں۔

اتنا کہتے ہی نوجوان ان سیّد صاحب کے ساتھ ہولیا۔ اور دونوں بنچ پر بیٹھ گئے تو جس پر سلسلہ گفتگو اسطرح شروع ہوا۔

سیّد صاحب ۔ ہاں بیٹا عبدالستار میں نے سُنا ہے کہ تم نے نوکری کر لی ہے۔ اور کیا تنخواہ ملتی ہے۔

عبدالستار ۔ حضور میرے لئے تو بہت ہی کافی ہے۔

سید صاحب ۔ پھر بھی کتنی۔

عبدالستار ۔ سنّو روپیہ۔

سیّد صاحب ۔ بھئی ستار تنخواہ تو معقول ہے۔

عبدالستار ۔ جی ہاں۔

سید صاحب ۔ (ستار کے چہرے کو غور سے دیکھکر) بیٹا تمہارا چہرہ زرد معلوم تا ہے۔ کہو خوش تو ہو۔

عبدالستار ۔ جناب خدا کا فضل ہے صرف دھوپ میں آنے کی وجہ سے

طبیعت گھبرا رہی ہے۔

یہ اسی گفتگو میں تھے۔ کہ ٹرین کی آمد کا گھنٹہ بجا۔ اور یہ دونوں شخص اُٹھ کر پلیٹ فارم پر جا کھڑے ہوئے۔ اور اچانک ایسا شور تھا۔ کہ تمام پلیٹ فارم نمونہ محشر بن گیا کوئی تو گاڑی آتا ہے۔ گاڑی آتا ہے پکار رہا تھا۔ کسی جگہ سے جلدی سامان اٹھاؤ کا آواز سنائی دے رہا تھا۔ کسی جگہ انگریز لوگ اپنی اپنی میم صاحب کی کلائی میں کلائی ڈالے خوشیوں کے قہقے لگا رہے تھے۔ اور دکاندار۔ پان سگرٹ۔ پان سگرٹ۔ حلوا پوری گرم روٹی۔ ٹھنڈا پانی شربت مسلمان۔ ہندو پانی۔ ناگپوری سنترے وغیرہ وغیرہ کی صدائیں لگا رہے تھے۔ جنہوں نے کانوں کو بہرہ کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد پنجاب لکھنو میل لاہور کے نمبر پانچ پلیٹ فارم پر شان شان کرتی ہوئی آن موجود ہوئی۔

گاڑی کا آنا تھا۔ کہ تمام پلیٹ فارم نمونہ محشر معلوم ہونے لگا۔

سٹیشن قلیوں کا قلی قلی پکارنا۔ دوستوں کا دوستوں سے مل کر قہقے لگانا۔ مسافروں کا اُترنا۔ چڑھنا۔ لوگوں کا اپنے عزیزوں کو دوڑ دوڑ کر ڈھونڈھنا ایک عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔

اسی طرح ہمارے نوجوان مسٹر عبد الستار اور سید حاتم علی صاحب بیرسٹر اپنے عزیز کی تلاش میں ہیں۔ جب وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تو سید حاتم علی صاحب نے اِدہر اُدہر ڈھونڈھنا شروع کیا۔

مسٹر عبد الستار بھی ڈھونڈنے جانے ہی والے تھے۔ کہ جگر میں میٹھی درد ہوئی۔ اور دل دھڑ دھڑ کرنا کرنے لگا۔ چہرے کا رنگ جو ابھی ابھی کندن سا سُرخ تھا۔ پیلا ہونا شروع ہو گیا۔

شاید گرمی کیوجہ سے طبیعت علیل ہو گئی ہے۔ نہیں۔ کیونکہ بیماری کے علامات تو ظاہر نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ اچانک یہ اوداس ہو گئے ہیں۔ آخاہ اب اپنے دہان مبارک سے کچھ فرما بھی رہے ہیں۔

اے دل تو کیوں دھڑکتا ہے۔ خدا کے لئے اسقدر بے چین نہ ہو۔ تیرے بیقرا ہونے سے میں اپنے عزیز دوست کے ملنے سے رہ گیا ہوں۔ آخر تمہیں کیا ہوا۔ آہ جگر میں بھی میٹھی میٹھی درد ہے۔ کیا تم نہ مانوگے۔ ہائے افسوس یہ کان کس کی پیاری پیاری آواز سن رہے ہیں۔ (ادہر اُدہر دیکھکر) یہاں تو کوئی نہیں۔ کیا میں دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ نہیں نہیں میں دیوانہ نہیں ہو سکتا میں تو ہوش میں ہوں۔

ناظرین ہمارے زندہ دل نوجوان مسٹر عبدالستار اپنے دل سے اسی طرح گفتگو کر رہے تھے۔ کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

آواز۔ او میرے پیارے دوست عبدالستار کس خیال میں محو ہو۔ کیا ہم سے نہیں ملوگے۔

اس آواز کا آنا تھا۔ کہ مسٹر ہوشیار ہوئے اور سامنے کیطرف دیکھا۔ تو اسی دوست کو آتے دیکھا۔ جسکو دیکھنے کے لئے جناب اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔

اتنے میں وہ نوجوان بھی آپہنچا۔ اور دوڑ کر عبدالستار کے گلے سے لپٹ گیا اور عبدالستار بھی بھائی افتخار کہہ کر زور سے چمٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد افتخار احمد نے یوں کہا۔

افتخار احمد۔ کہو بھائی مزاج تو اچھے ہیں۔

عبدالستار۔ شکر الحمد للہ آپ سنائیں۔ اتنے دنوں کلکتہ میں خوش تو رہے

افتخار۔ نہائت ہی اچھی طرح سے خدا کے فضل و کرم سے گذر رہی ہے۔ آپ پہلے مجھے اپنے کام کاج کی سنائیے۔

عبدالستار۔ پڑھائی تو میں نے تین ماہ سے چھوڑ دی ہے۔ اب دفتر میں سو روپے پر ملازمت کر لی ہے۔

افتخار۔ کم از کم ایف۔ اے کا امتحان ہی دے دیا ہوتا۔

عبدالستار۔ بھائی سچ پوچھو تو پڑھائی بہت کر لی۔ واللہ کتاب پکڑنے

کو اب جی نہیں چاہتا۔

یہ گفتگو کرتے ہوئے دونوں دوست اس جگہ جا پہنچے۔ جہاں کہ سامان اُترایا جا رہا تھا۔

افتخار۔ آیئے ابا جان زنانہ کمرے میں ہمشیرہ صاحبہ کو لے آویں۔ جعفر نوکر کا نام ہی کو یہاں کھڑا رہنے دیجئے۔

باپ بیٹا دونوں چلنے لگے کہ مسٹر افتخار احمدؔ نے اپنے دوست کو بھی ساتھ چلنے کا اصرار کیا۔ اور ساتھ ہی لے گئے۔

اب تو عبدالستار کا سر چکرانے لگا۔ دل زیادہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اور قدم منوں منوں کا معلوم ہونے لگا۔ اگر قدم آگے بڑھاتا تو وہ پیچھے ہی آتا خیر بدقت دشوار زنانے کمرے تک پہنچے۔ اور افتخار احمدؔ جھٹ زنانے کمرے میں گئے اور اپنی ہمشیرہ کو کہا۔

آیئے ہمشیرہ صاحبہ اب اُترو۔ دیکھو ابا کھڑے ہیں۔ امّی آپ بھی تشریف لائیں تھوڑی دیر کے بعد دو بُرقعہ پوش باہر نکلیں۔ ایک کا سفید اور ایک کا سیاہ رنگ کا تھا۔ سفید بُرقعے والی خاتون چال ڈھال سے معلوم ہوتی تھی۔ کہ چالیس سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور دوسری سیاہ بُرقعہ پوش بالکل نوجوان تھی۔ اسکا سن غالباً چودہ یا پندرہ کا ہوگا۔

پیارے ناظرین میں اس کے قدِ رعنا کی کیا تعریف لکھوں۔ قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ خامہ فرسائی کرسکے۔ سرو سے اگر تشبیہ دوں۔ تو سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ سرو اس لائق نہیں۔ کہ اس نازنین سے برابری کا رتبہ حاصل کرے۔ تمام اشٹیشن اس کے قدِ رعنا کو دیکھکر انگشت بدندان ہے۔

زاہد لوگ جو کہ بہشتی حوروں کی چاہ میں رکوع و سجود میں رہتے ہیں۔ اگر اس نازنین کے قد کو دیکھ لیں۔ تو یکدم تمام عبادت کو بالائے طاق رکھدیں۔ اور سمجھ لیں۔ کہ بس حور ہے تو یہی ہے۔

اگر ہمارے ہیرو مسٹر عبدالستار کا دل اس نازنین پر آیا تو کوئی بیجا نہیں۔ کون دل ہے جو اس رشک قمر جسکا حسن ہر قسے سے نکلا پڑتا ہے۔ دیکھکر فدانہ ہو جاوے۔

اب ذرا مسٹر عبدالستار کی بھی خبر لینی چاہیے۔ وہ دیکھئے چہرہ زرد ہے۔ آنکھیں اس نازنین کے قدِ موزوں کو دیکھ رہی ہیں۔ ہونٹوں پر کاہی سی جم رہی ہے۔ وہ دیکھئے جناب بے ہوش ہونے کو ہیں۔

افتخار احمد۔ ایں۔ بھائی ستار خیر تو ہے۔ دشمنوں کی طبیعت کیسی ہے۔

عبدالستار۔ (ہوش قایم کر کے) کچھ نہیں۔ یونہی گرمی کیوجہ سے دماغ میں خلل آگیا ہے۔

افتخار احمد۔ تو چلئے سوڈا واٹر ہی پی لیجئے۔

عبدالستار۔ نہیں چنداں ضرورت نہیں خود ہی درست ہو جاوے گی۔

مسٹر افتخار احمد نے ہرچند اصرار کیا۔ مگر عبدالستا نے سوائے "نہ" کے ہاں نہ کہا۔ آخر مجبور ہو کر افتخار احمد نے سامان وغیرہ کی طرف دھیان کیا۔ اور اسباب کو گنا اور چلنے کی تیاری کرنے لگا۔

افتخار احمد۔ (ستار سے) بھائی آپ کو بہت تکلیف ہوئی معافی کا خواستگار ہوں۔

عبدالستار۔ اجی واہ تکلیف کیسی۔

افتخار احمد۔ یہی جو آپ نے مجھ ناچیز کے لئے اتنی دھوپ میں آنے کی تکلیف گوارا فرمائی

عبدالستار۔ واہ صاحب یہ بھی کوئی تکلیف ہے۔ واللہ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں

افتخار احمد۔ خیر کچھ بھی ہو۔ مگر یاں دفتر سے بالکل چھٹی لے آئے ہیں۔ یا پھر تشریف لے جاویں گے۔

عبدالستار۔ میں نے چھٹی لینے کی بہت کوشش کی۔ مگر سب بے سود ثابت ہوئی۔ چونکہ کام بہت ہے۔ اس لئے صاحب بہادر نے نہیں مانا۔ اسلئے مجبوراً اتنے وقت کی چھٹی لینی پڑی۔

افتخار احمد۔ (باپ سے) آبا جان آپ امی و ہمشیرہ صاحبہ کو لے چلیں۔ میں ذرا مسٹر عبدالستار کو وداع کر آؤں۔ آپ گیٹ (دروازہ) پر میرا انتظار کریں۔

سید حاتم - کیوں بیٹا ستار - آپ اتنے ہی وقت کے لئے چھٹی لائے تھے - میں نے سمجھا تھا - کہ آپ بالکل ہی آ گئے ہونگے -

عبد الستار - جناب عالی میں نے بہت کوشش کی - مگر کام کیوجہ سے مجھے اپنے ارادے سے دست بردار ہی ہونا پڑا -

سید حاتم - تو اب پھر دفتر جاؤگے -

عبد الستار - جی ہاں -

اتنا جواب دیکر مسٹر عبد الستار آگے بڑھے مصافحہ کیا - اور مسٹر افتخار احمد کا ہاتھ پکڑ کر روانہ ہوئے - مگر دل اسی نازنین کیطرف مائل تھا - ہر چند خیال کسی اور طرف دوڑاتا - مگر خیالی تصور اسی حالت میں جس حالت میں نازنین کو دیکھا تھا - سامنے لا کھڑا کرتا تھا - خیر بدقت دشوار آخری نظر اسی نازنین پر ڈالی - اور افتخار کے ساتھ تیزی سے چلنے لگا -

جب ڈیوڑھی میں پونچے - تو سید حاتم فٹن میں بیٹھے تھے - اور اپنے فرزند ارجمند یعنی افتخار احمد کی انتظار کر رہے تھے - اتنے میں وہ دونوں دوست بھی آ گئے - صرف یہ الفاظ کہکر کہ مسٹر افتخار احمد سوار ہو گئے -

افتخار احمد - کہ اب انشاء اللہ چار ہی بجے ملاقات ہوگی -

عبد الستار - جی ہاں -

عبد الستار کا "جی ہاں" کا لفظ سنکر افتخار احمد نے کوچوان کو چلنے کے لئے کہا - جو اشارہ پاتے ہی دوڑاتا ہوا یہ جا وہ جا نظر سے غائب ہو گیا -

مسٹر عبد الستار کا دل اب بھر آیا - اپنی نادیدہ معشوق کی یاد نے از حد بیقرار کرنا شروع کیا - آخر کار آنسوؤں کی بارش دیدہ تر سے شروع ہو گئی - ایک کونے میں چھپ کر خوب ہی روئے - آخر روتے روتے دفتر کا خیال آیا - اور آنسوؤں سے چہرہ صاف کیا - اور جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے دفتر کو روانہ ہوئے -

دفتر میں پہنچکر کام کرنے بیٹھے مگر عشق کے بندے کب کسی اور طرف رجوع ہوتے

ہیں۔ ان کا کام تصور جاناں کے شوق میں آنسو بہانا ہے اور خوراک ان کی خون جگر ہے۔ پیاس شربت دیدار ہے۔

اے عشق تیرا خانہ تباہ کیسے کیسے جلیل القدر حسین۔ مہ جبین۔ تم نے تباہ کئے۔ اُن سے صحرا و بیابان کے تنکے چنوائے۔ کسی کو میاں مجنوں کا القاب دیا۔ کسی کو فرہاد کوہکن کے نام سے مشہور کیا۔ شاہ جسکے آگے خلق اللہ جبین نیاز جھکاتی ہے۔ تیری ستم گری سے پاپیادہ دیار محبوب کا راستہ لیتا ہے۔ آہ ظالم تجھکو کسی کی عزت کا بھی خیال نہیں۔ اُف اُف عزت دار کو بے عزت کرنا تیرا ایک ادنے کھیل ہے۔

خیر ہمارے عبدالستار نے جبراً قہراً جسقدر کام ہوسکا کیا۔ اور چار بجتے ہی گھر کا راستہ لیا۔ گھر میں آتے ہی کوٹ پگڑی پھینک پلنگ پر جا دراز ہوئے۔ اور نازنین کی چاہ میں خون کے آنسو بہانے لگے۔ اور دل ہی دل میں یہ کہنے لگے۔

اے سیاہ پوش نازنین کیا میں تیرے عشق کا سودا اسٹیشن پر مول لینے گیا تھا۔ آہ کیا معلوم تھا۔ کہ اسٹیشن پر جانا گویا جان عذاب عشق میں ڈالنا ہے۔ اُف ری نازنین تجھے کیا معلوم کہ ایک بدنصیب تیرے قد کو ہی دیکھکر تجھ پر فریفتہ و شیفتہ ہوچکا ہے۔ تیرا حسن لاثانی تیرے سیاہ برقے میں سے پھوٹا پڑتا تھا۔ جسکو دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ ہائے میری ظاہری آنکھیں تو صرف تیرا سرو قد اور ہاتھ کی سفید انگلی جن کہ مہندی لگی تھی۔ دیکھ سکیں۔ آہ آہ کیا منحوس دن ہے کہ دل سے ہاتھ دھونے پڑے پھر خود ہی ہاہیں نہیں منحوس کیوں ہونے لگا تھا۔ یہ خوش قسمتی کا دن ہے۔ کہ میں بھی فرہاد کی طرح بغیر دیکھے عاشق ہوا۔ آہ اے میری جان دیکھ دیکھ تیرا نادیدہ عاشق زار۔ نیم بسمل ہے۔ ہائے . . . . میں مرا۔ ہائے میں مرا کا لفظ اس زور سے نکلا۔ کہ ساتھ کے کمرے میں اُن کی والدہ ماجدہ مشین پر بیٹھی کپڑے سی رہی تھیں۔ اچانک یہ آواز سنکر ڈر گئیں۔ کہ آہ ستار کو خیر تو ہے۔ اسی وقت الفت مادری نے جوش مارا۔ اور لپک کر ستار کے پاس آئیں۔

جا کر اپنے نور نظر لخت جگر کا حال پر ملال پایا۔ آنکھوں سے آنسو مانند باراں کے

مسلسل جاری ہیں۔ گلابی رخسار گل نیلوفر سے زرد ہیں۔ ہونٹوں پر کاہی سی جمی ہے۔ اور گھڑی گھڑی سر کے بال نوچ رہا ہے۔

اب تو رہے سہے حواس بھی رفوچکر ہو گئے۔ اور مانند دیوانوں کے لپکیں اور بیٹے کو اٹھا کر چھاتی سے لگایا پیشانی کو بوسہ دیا۔ آنسو چہرے سے پونچھے اور کہا۔

والدہ ستار۔ کیوں بیٹا خیر تو ہے یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔

(جواب نہ پاکر) آخر کچھ کہو گے بھی یا نہیں۔ یا یونہی اپنی امی کو ہلاک کرو گے۔ خدا کے واسطے بولو۔ یہ لبوں پر مہر خاموشی کیسا لگ گیا۔ آہ بیٹا "صُمٌّ بُکْمٌ" کیوں ہو۔ دیکھو دیکھو تمہاری امّی شدت غم سے نڈھال ہوئی جاتی ہے۔ (اور زور سے چمٹ گئی)

اب تو ناول کے ہیرو ہوش میں آئے۔ اور سخت شرمندہ ہو کر کہ افسوس میری بے تابی نے یہ کیا گل کھلا دیا۔ آہ راز عشق عیاں ہوا ہی چاہتا ہے (امّی سے)

عبدالستار۔ ہاں میری امی جان ہیں کہیئے کیسے تشریف لائیں۔

والدہ ستار۔ (پیشانی پر بوسہ دیکر) دشمنوں کی طبیعت کیسی ہے۔

عبدالستار۔ امّی جان خدا کا فضل ہے۔ کچھ نہیں صرف بوجہ گرمی کے سر میں درد ہے۔

والدہ۔ اور یہ بیتابی اور ہائے وائے کیسی ہنیں نہیں تم بیٹا چھپاتے ہو۔ اپنی امّی سے حال دل کہو۔ بیٹا اس کے پورا کرنے کے لئے تیار ہوں۔

عبدالستار۔ جو بات تھی۔ سچ عرض کر دی ہے۔ آگے ماننا نہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے۔

والدہ۔ میں اعتبار کیسے کروں۔ تمہارا چہرہ عجیب و غریب رنگ بدل رہا ہے۔ اچھا نہ بتاؤ میں تمہارے ابا کو بلاتی ہوں۔ اتنا کہتے ہی ماما وزیرن کو آواز دی۔ جو آواز سنتے ہی بھاگی ہوئی آن موجود ہوئی۔

والدہ۔ ماما نیچے سے ستار کے والد کو تو بلا لا۔ ماما نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دیکھا۔

ٹ بھاگی ہوئی نیچے گئی۔ اور والد ستار کو بلا لائی۔
تھوڑی دیر کے بعد میاں محمد سعید صاحب آن موجود ہوئے۔ اور بیٹے اور بیوی کو اس حال میں دیکھکر خود بھی حواس باختہ ہوگئے۔ پوچھنا چاہا۔ مگر مہر سکوت ایسا لگا کہ جسکا توڑنا امکان سے باہر ہوگیا۔
ناظرین والاتمکین آپ آپ خود ہی منصفی کریں۔ کہ جن والدین کا لاڈلا بیٹا جوکہ نازونعمت سے پالا ہو۔ اور حسن میں بھی یکتائے عصر ہو۔ عمر بھی میں اکیس سال کی ہو۔ اس طرح اچانک بیمار ہو جاوے۔ تو ان پر کیا حشر برپا ہوتا ہوگا۔ اب اسی طرح ہمارے محمد سعید صاحب کا حال ہے۔ انہوں نے نہایت ہی جبر سے رقت آمیز لہجے میں کہا۔
محمد سعید۔ بیٹا کہو تو کیا ہوا۔ کس مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہو۔
عبدالستار۔ (جسکو ان الفاظوں نے سخت چوٹ لگائی اور اٹھکر) ابا جان کچھ نہیں۔ آپ کیوں فکر کر رہے ہیں۔ مجھ ناچیز پر خدا کا فضل ہے۔ آج بھائی افتخار احمد کو دفتر سے اسٹیشن پر لینے گیا تھا۔ واللہ اسقدر دھوپ نے پریشان کیا۔ کہ بیان نہیں کرسکتا۔ بس اس وجہ سے سر میں درد سی معلوم ہوتی ہے۔ کہ میں نہائت ہی بے قرار ہو رہا ہوں۔
محمد سعید۔ (نبض دیکھکر) نہیں بیٹا تمہیں تو ضعف سا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو تمہاری نبض کس قدر ہلکی چل رہی ہے۔
عبدالستار۔ ہوگی۔ مگر میں تو بفضل تعالے تندرست ہوں۔ البتہ دفتر سے جب آیا تھا۔ تو تکلیف تھی۔ اب آپ تشریف لے جاویں۔
والدہ ستار۔ تب تک نہ جاویں گے۔ جب تک تم غسلخانے میں جاکر نہاؤ گے نہیں۔
اتنا سنتے ہی ستار شکستہ دلی سے اٹھا۔ غسل خانے میں غسل کیا۔ اور والدہ کے کہنے سے سیر کو روانہ ہوا۔

منصوبے

اس واقع کے دوسرے ہی دن صبح کے نو بجے جبکہ فلک نکھرا ہوا نیلگوں تھا۔ آفتاب عالمتاب اس کی نیلی مخمل پر بڑی نزاکت و ملاحت سے قدم رکھتا ہوا مغرب کیطرف چلا جا رہا تھا۔ اور تمام عالم کو اپنے رُخ منور سے تاباں کر رہا تھا۔
اس وقت ہمارے ناول کا ہیرو عبدالستار اپنے مکان سے برآمد ہوا۔ آخاہ آج تو خوب جنٹلمین بنے ہوئے ہیں۔ واللہ اس وقت کا حسن بھی قابل دید ہے۔ کون بشر ہے۔ جو اُنکو دیکھکر صرف ایک بات کرنے کا شایق نہ ہو سر پر تُرکی سُرخ ٹوپی سرخ و سفید چہرے پر خوب بہار دے رہی ہے۔ گویا کہ شفق کی سُرخی چاند کے قریب ہے۔ چہرہ ماہتابی بھی چاند کی ہمسری کا دعوے کر رہا ہے۔ سن پروف کا کوٹ زیب بدن ہے اور اس کے نیچے سفید شلوار ہے اور پاؤں میں سادہ بوٹ ہیں۔ جو بڑی نزاکت سے زمین پر رکھتے ہوئے بازار میں رونق افروز ہوئے دوستوں سے مِل مِلاکر دفتر کو زینت بخشنے کے لئے روانہ ہوئے۔
تھوڑے ہی قدم گئے ہونگے۔ کہ کل کا واقع یاد آیا۔ اور اس وقت بائی چانس By chance اسی مکان کے نیچے سے گذر رہے تھے۔ جس پر کہ اُنکی معشوقہ دلنواز قیام گزین تھی۔ وہیں ٹھٹھک گئے۔ اور آہ دل پُردرد سے ایسی کھینچی جسکا شعلہ آسمان تک پہنچا۔ یقیناً آسمان جلکر خاکستر ہو جاتا۔ اگر اس پر سایۂ خدا اور نور محمدی نمایاں نہ ہوتا۔

ہمارے ہیرو نے بہت چاہا کہ سنبھلے اور آنسوؤں کو اپنے مہتابی رُخ پر نہ ٹپکنے دے۔ مگر یہ کرنا اُن کے امکان سے بعید تھا۔ آخرکار آنسو نکل ہی پڑے چہرہ بھی ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔ تو سعدی سُنار کی دکان پر بیٹھ گئے۔ اور آنکھوں کو ملنے لگے۔ کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہو۔ کہ آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ مگر یہ اُن کو معلوم نہ

مقالہ ع

تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

اس سنار کی دکان کے قریب ایک کارخانہ تھا جسکا نام کہ قریشی ہیٹیل ورکس ہے۔ اپر ایک ہٹا کٹا شخص بیٹھا تھا جو عمر میں تو بائیس تئیس سے زیادہ نہ تھا۔ مگر اس کی آنکھوں سے حرامزادگی اور شرارت ٹپک رہی تھی۔

جب ہمارے ہیرو عبدالستار اس مکان کے نیچے پہنچے تھے۔ اور حالت دگرگوں ہو گئی تھی۔ تو وہ شخص اُنکو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جب مسٹر عبدالستار نے سینے پر ہاتھ رکھکر اس گھر کی طرف نظر کی۔ اور بڑبڑائے تو وہ شخص اُنکے سر ہو گیا۔ کہ ضرور اس مکان میں اُسکی آشنا قیام گزیں ہے۔ پھر جب ہمارے ہیرو بے اختیار رو دیئے۔ تو اُسکا شبہ یقین سے بدل گیا۔ یہ شخص گرفتار محبت ہے۔ اور یہی گھر اس کی جان جاناں کا ہے۔ اور بہت ہی غضبناک نگاہوں سے سنار کو دیکھنے لگا۔

جب ہمارے ہیرو کو رونے دھونے سے فرصت ملی۔ تو پھر گھر واپس گئے اور جاتے ہی اپنے کمرے میں گھسے۔ اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

ابھی یہ اچھی طرح بیٹھے بھی نہ تھے۔ کہ نظر میز پر پڑی۔ کہ ایک کور الفافہ پڑا ہے دیکھکر حیران ہوئے۔ کہ ابھی تو میز خالی پڑی تھی۔ اور اب میرے باہر جاتے ہی یہ خط کہاں سے آگیا۔ خیر اُسکو اٹھایا۔ تو ایک چھوٹا سا رقعہ نکلا۔ اُسے کھولا تو یہ لکھا پایا۔ کہ

منزل عشق بہت ہی کٹھن منزل ہے۔ ذرا سوچ سمجھکر اس میں قدم رکھنا۔ کہ باعث ننگ ہے۔ اگر عشق کا جن سر پر سوار ہو ہی گیا ہے۔ تو مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

جب یہ رقعہ پڑھا۔ تو مسٹر ستار کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ افسوس میرا راز دل آشکارا ہو گیا۔ آہ یہ کون شخص ہے کہ جو میرے راز سربستہ سے آگاہ ہے۔ میں نے کسی سے کہا بھی نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکا۔ آشکارا نہ ہونے دیا۔ مگر

حیرت کی بات تو یہ ہے۔ کہ آیا یہ کسی جن کا کام ہے یا انسان کا۔ انسان تو انسان جن تلک بھی میرے دلی ارادوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ آخر یہ کون شخص ہے جس نے میرے راز سے آگاہ ہو کر یہ رقعہ مجھے تحریر کیا ہے۔ اچھا گذشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط۔ اب جہاں تک ہو سکیگا۔ اس شخص کا پتہ لگاؤنگا۔ کہ جو مجھے منزل عشق میں قدم رکھنے سے ڈراتا ہے۔ کیا میں کوئی بزدل ہوں۔ کہ ایسے کمینے الفاظوں سے ڈر جاؤں۔ نہیں نہیں ستار بات کا پکا۔ عاشق صادق ہے۔ (گھڑی کو دیکھکر) اُف ادہو دس ہو گئے۔ بہرحال آج کے دن کی رخصت لینی ہی مناسب ہے۔

اتنا کہا اور عرضی لکھنے کو بیٹھ گیا۔ جسمیں شکائیت بیماری تحریر کی۔ نوکر کو بلاکر چٹھی دفتر روانہ کی۔ اور خود ملاقات کے منصوبے سوچنے لگے۔

ابھی تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ کہ اُن کے پرانے دوست جو بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ آن موجود ہوئے جنکو دیکھکر ستار کے رنجیدہ چہرے پر تبسم نمایاں ہوا۔

آنیوالا۔ کہئے مسٹر مزاج تو اچھے ہیں۔

عبد الستار۔ شکر ہے اس ذو الجلال کا۔ آپ کیسے تشریف لائے۔ اور آپکو میرے گھر ہونیکا کس سے پتہ ملا۔

آنیوالا۔ میں ادھر سے گذر رہا تھا۔ کہ آپ کا خادم ملا۔ اس سے میں نے پوچھا۔ بھئی کیوں بھاگے جا رہے ہو۔ جس کے جواب میں اُس نے کہا۔ کہ میاں صاحب کی طبیعت آج علیل ہے۔ انہوں نے درخواست دی ہے۔ اور میں اُسے لئے جا رہا ہوں۔

عبد الستار۔ ہاں میری طبیعت آج علیل ہے۔

آنیوالا۔ تب ہی دُبلے ہو رہے ہیں۔ واللہ کوئی مہلک مرض معلوم ہوتی ہے۔ جس نے ایک ہی دن میں آپکا رنگ و روپ بگاڑ دیا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ کہ ایسی کونسی مرض ہے جس نے دُبلا کر دیا ہے۔

عبد الستار۔ بھائی احمد نواز (اس نوجوان کا نام ہے) سر میں درد ہے جگر جل رہا ہے۔

احمد نواز۔ کچھ سبب بھی تو ہوگا۔

عبدالستار - ان بیماریوں کے سبب کیا ہو سکتے ہیں۔ بھائی اسکا حال مجھ سے نہ پوچھو
احمد نواز - وہ کیوں۔
عبدالستار - میں نے جو کہدیا ہے۔ کہ اس بات کو نہ پوچھیں۔ خدا کے لئے کچھہ اور بات کریں۔
احمد نواز - ارے بھائی کچھہ کہو تو میں بھی سنوں - واللہ کیا غضب کر رہے ہو۔ آہ ستار اپنے دوست دلنواز سے پرہیز - افسوس - افسوس۔
مسٹر احمد نواز کی طبیعت قدرتی طور پر شکی تھی۔ حالانکہ بی - اے کے سٹوڈنٹ تھے مگر جس بات کے درپے ہو جاویں تو کیا مجال کہ اس کے حل کئے بغیر اسکا پیچھا چھوڑ دیں۔ ناظرین والا تمکین آپ کو ان کی اس طرز گفتگو سے پتہ چلگیا ہو گا۔ باقی آگی ذیل کی تقریر سے پتہ چل جاویگا۔
احمد نواز - خیر نہ بتاؤ - تمہاری مرضی میں سمجھتا تھا۔ کہ آپ میرے دوست صادق ہیں۔ مگر افسوس یہ تمام وہم و گمان ہی تھا۔ بھائی میں تو اب تک تمہیں مشفق و شفیق سمجھتا ہوں۔ تم چاہے جو کچھہ خیال کرو۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ تکلیف کے باعث اپنا حال تم ایکدن ضرور مجھسے کہدوگے۔ اب نہ سہی وقت مصیبت ہی سہی (خدا نہ کرے) بھائی ایسے موقعوں پر دوست کچھہ نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ تمام راز سے آگاہ نہ ہوئے۔
عبدالستار - واللہ تمہاری اس مؤثر تقریر نے خواہ مخواہ مجھے راز دل کہنے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی۔ کہ سر کٹ جائے۔ مگر راز دل کسی پر عیاں نہ ہونے دونگا۔ مگر تمہاری محبت نے مجھے کچا چٹھا کہنے پر مجبور کیا ہے۔
احمد نواز - میں آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ کہ حقیر کی قدر ابھی تک آپ کے آئینہ دل پر باقی ہے۔ میں اس حوصلہ افزائی کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ واللہ میرے دل میں ایسے ایسے وسوسے آنے لگے تھے۔ کہ میں رنجیدہ ہونے لگا تھا۔ اس وقت آپ نے میری حوصلہ افزائی ہی نہیں کی۔ بلکہ مجھہ وہم و گمان کے پتلے کو وہم و گمان سے مبرا کیا ہے

عبدالستار۔ مگر اس سے پہلے کہ تمام حال سے آگاہ کردوں یہ بھی واضح کردینا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ اپنے دل میں سوچ لو سمجھ لو۔ کہ جو واقعہ میں ابھی تم پر عیاں کرنے والا ہوں اس میں حق دوستی ادا کرنا پڑیگا بعد میں ایسا نہ ہو۔ کہ مجھکو آپ پر بے وفائی کا لفظ عاید کرنا پڑے۔

احمد نواز۔ تو کیا آپ کے خیال میں مَیں بے وفا ہوں؟

عبدالستار۔ یہ مرا مطلب واللہ نہیں ہے۔ بلکہ میں تم سے پکے عہد وپیمان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ انسان کی طبیعت بدلتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

احمد نواز۔ تو بھئی مجھے وہی ترکیب بتا دو۔ کہ جس سے تمہیں یقین ہو جائے۔

عبدالستار۔ زیادہ تو میں نہیں کہتا صرف اسی قدر عرض ہے۔ کہ تم میرے سر کی قسم کھاؤ۔ تو واللہ ابھی راز دل عیاں کئے دیتا ہوں۔

احمد نواز۔ مجھے تمہارے سر کی قسم۔ ہرگز کسی مصیبت کے وقت دغا نہ دونگا۔ بلکہ اگر تم خدا نہ کرے کسی مصیبت میں مبتلا ہو بھی گئے۔ تو تمہیں اس سے آزادی دلانے کے لئے جان و مال تک لٹا دونگا۔ کہو اب بھی خوش ہو یا نہیں۔

عبدالستار۔ خوش تو پہلے ہی تھا۔ مگر اب بہت ہی خوش ہوں (گلے سے لگا کر) مجھے پہلے ہی امید تھی۔ کہ اگر دوستی کا حق نبھائیگا۔ تو یقیناً مسٹر احمد نواز ہی نبھائیگا اور کسی کا کام نہیں۔ کہ میرے ساتھ جلتی آگ میں سوائے تمہارے کوئی اور کود پڑے۔

احمد نواز۔ آہ بھائی۔ میں کس لائق ہوں۔ مگر خدا کے لئے اب وہ واقع تو سنا دیں کہ دل بیقرار آپے سے باہر ہو رہا ہے۔

عبدالستار۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ کل بھائی افتخار احمد جن کا ذکر میں عموماً آپ کے روبرو کیا کرتا تھا۔ تشریف لائے تھے۔ میں انکو اسٹیشن پر لینے گیا۔ آہ بھائی نواز وہ کیا آئے گویا میرے لئے بجلی لائے۔ (آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں)

احمد نواز۔ ہاں ہاں کہو۔ (دلاسا دیکر) بھائی مت رو۔ صبر کرو صبر کرو۔ کہ صبر کا پھل ہمیشہ شیریں ہوتا ہے۔ دیکھو۔ دیکھو میرا بھی دل بیٹھا جاتا ہے۔ (آخر آنسو

نکل پڑے۔ اخیر نہ سناؤ۔ پھر کسی وقت سن لیں گے۔ اتنے نڈھال کیوں ہوئے جاتے ہو۔
عبدالستار۔ جی سناؤں کا ضرور سناؤں گا اپنے محسن کو تمام حال سے آگاہ کرونگا
لو سنو۔

جب بھائی افتخار احمدؔ آئے تو وہ مجھے زنانہ کمرے میں لے گئے۔ جہاں سے مجھے ایک سیاہ برقعہ پوش نکلتے دکھائی پڑی۔ آہ آہ (ڈاڑھیں مار مار رونے لگا۔

احمدؔ نواز۔ عبدالستار ہوش کرو۔ اتنے دانا ہو کر ایک معمولی بات پر عورتوں کیطرح ٹسوے بہا رہے ہو۔ واہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ ابھی تو منزل عشق بہت دور ہے قدم رکھتے ہی تمہاری یہ حالت ہے۔ تو تمام منزل کاٹنے کرنا خاص تمہارے لئے بہت ہی مشکل ہے۔

عبدالستار۔ ارے بھائی کیا کروں۔ دلپر جبر نہیں ہوسکتا۔ بہت دفعہ جبر کی سِل سینے پر رکھی۔ مگر نامراد آنکھیں آنسوؤں کی بارش شروع کر ہی دیتی ہیں۔ جس سے عنان صبر ہاتھ سے یکدم چھوٹ جاتی ہے۔

احمدؔ نواز۔ مرد ہو کر تم صبر نہیں کر سکتے۔ بھائی مرد کو خدا نے وہ طاقت بخش رکھی ہے کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکے۔ مرد کے قوت بازو سے ہو سکتا ہے۔

عبدالستار۔ اب جہاں تک ہوسکیگا۔ اس بات کی سعی کرونگا۔ کہ صبر کروں۔ ہاں تو سنئے۔

جب مجھے وہ برقعہ پوش نظر پڑی۔ تو دل بے اختیار ہو گیا۔ اتنے میں وہ مہ جبین رشک قمر باہر جلوہ افروز ہوا آگے تو دل ہی بے اختیار تھا۔ مگر اب میں خود اس کی مئے الفت سے سرشار ہو گیا۔

احمدؔ نواز۔ مگر بغیر صورت دیکھے۔

عبدالستار۔ جی ہاں۔

احمدؔ نواز۔ واہ بھئی واہ تم اس عورت پر عاشق نہیں ہوئے۔ بلکہ اس کے برقعے پر عاشق ہوئے۔ بھائی خوب کہی۔ واللہ تب تو تمہیں برقعے کا عاشق کہنا چاہئے۔ (زور سے

ہنسنے لگا۔ ا

عبدالستار۔ بھائی نواز یہ کیسا مذاق ہے۔ میری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔ اور آپ کو مذاق کی سوجھی ہے۔ بھئی یہ چوچلے مجھے نہیں بھاتے۔

احمد نواز۔ واللہ تم تو دیوانے ہو گئے ہو۔ کہ بغیر شکل و صورت دیکھے عاشق بن بیٹھے۔ جاؤ۔ عقل کے ناخن کٹواؤ۔

عبدالستار۔ نواز تم مجھے کیوں ہنسی میں اُڑا رہے ہو۔ فرہاد بھی تو بغیر دیکھے شیرین کے حسن و جمال کا عاشق تھا۔ ذرا تشریح کے ساتھ مجھے اسکا جواب دیجئیگا۔

احمد نواز۔ اسکا جواب تو نہایت ہی آسان ہے۔ یعنی فرہاد نے شیریں کے حسن خداداد کا شہرہ سناتھا۔ تمام زمانہ شیریں کے حسن و جمال کو جانتا تھا۔ مگر کیا تم نے بھی میاں برقعے کے عاشق اپنی معشوقہ کا شہرہ سنا ہے۔

عبدالستار۔ نواز دیکھو تمہیں ہر ایک بات پر مذاق کی سوجھتی ہے۔ اور بات بات پر مجھے چٹکیوں میں اُڑاتے ہو۔ بھئی میرے خیال میں تم اچھا نہیں کرتے۔ بجائے اس کے کہ تم مجھے دلاسا دو۔ بلکہ اُلٹا میری ہی مٹی خراب کرتے ہو۔ میں کیا کوئی دیوانہ تھا۔ کہ ایسی ویسی عورت پر مائل ہو جاتا۔ تمہاری بات بڑی ہو۔ مانا کہ میں نے اس نازنین کو اپنی ان آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ تو کیا میرے دل کی آنکھیں اس کے حسن عالمتاب کو نہیں دیکھ سکتی تھیں میرے دل نے مجھے گواہی دی۔ کہ یہ عورت دنیا میں لاثانی ہے۔ دوسرا میں نے اس معشوقہ کی ایک سفید و نازک انگلی جس پر کہ مہندی لگی ہوئی دیکھی تو یقین کامل ہو گیا۔ کہ واقعی ایک پری اپر دۂ دنیا پہ اپنے حسن کا جلوہ دکھلانے آئی ہے۔ گویا خدا نے خاص میری خاطر یہ بہشتی حور بھیجی ہے۔ کہیں وہ تو نہیں ہے کہ بہشتی حور کی ہم بغلی کا مزا پاؤں۔

احمد نواز۔ واہ واہ اب تو تم خاصے شاعر بن گئے۔ کیسی پُر زور تقریر کی ہے۔ مگر شیخ چلی کیطرح خیالی پلاؤ دیکانا کب سے سیکھا ہے۔

عبدالستار۔ (ہاتھ جوڑ کر) خدا کے لئے نہ ستاؤ۔ بھائی نہ ستاؤ۔ چاہے وہ تمہارے

خیال کے مطابق ڈائن یا بھتنی ہو۔ تمہیں کیا۔ اپنی ناصحائی اپنے پاس رکھو۔ ؎

ناصحا مت کر نصیحت کیا ہمیں سمجھے ہے
ننگ و بد سوجھے نہیں جب دل کہیں الجھے ہے

مجھے کوئی ترکیب بتا سکتے ہو تو بتاؤ۔ ورنہ خواہ مخواہ مجھے کیوں دق کر رہے ہو۔

احمد نواز۔ بہت خوب خفا نہ ہو جیئے۔ اور کیا آپ انکو جانتے ہیں۔ کہ کس کی بیٹی۔ اور کہیں افتخار احمد کی بیوی تو نہیں۔

عبد الستار۔ ہاں میں بخوبی اُن کے حسب و نسب سے واقف۔ ارے میاں وہ تو مسٹر افتخار احمد کی ہمشیرہ ہیں۔ اور سید حاتم علی بیرسٹر کی دختر نیک اختر اور نور نظر ہیں۔ کیونکہ افتخار احمد صاحب ابھی تک نا کتخدا ہیں۔ اور یہی ایک بیٹی اور ایک بیٹا سید صاحب کا ہے۔

احمد نواز۔ جبکہ تم اپنی معشوقہ کو جانتے ہو۔ تو ضرور صورت و سیرت سے آشنا ہو گئے ہو گے یا نہیں۔

عبد الستار۔ شکل و صورت تو کجا میں اپنی معشوقہ دلنواز کے نام سے بھی آگاہ نہیں۔

احمد نواز۔ تو بھئی تمہیں یقین ہے۔ کہ وہ نازنین سید صاحب ہی کی نور نظر ہیں۔

عبد الستار۔ یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ انکی ہی دختر اپنے چچا اور بھائی مسٹر افتخار احمد کے پاس کلکتہ میں گئی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُن کے چچا وہاں سوداگر ہیں۔ اور اُن کے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ انہوں نے وہاں مسٹر افتخار احمد کو بلایا ہوا ہے۔ اور وہی گویا کہ اس کے باپ ہیں۔ خیر جس دن یہ کلکتہ روانہ ہوئیں تھیں تو By chance میں اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے سید صاحب سے دریافت کیا۔ کہ کہاں تشریف لیجا رہے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ افتخار احمد کی ہمشیرہ کو کلکتہ لے چلا ہوں۔ کہ چچا اور بھائی کے لئے بہت اداس ہے۔

احمد نواز۔ تو کیا تم اس سے سچی الفت رکھتے ہو۔

عبد الستار۔ ہمی بالکل سچی۔ بھائی نواز میں عاشق صادق ہوں اتنا کہتے ہی اس

پہلے رقعے کا خیال آیا۔ جو اچانک ملا تھا۔ تو یوں کہا۔) ہاں بھائی ایک رقعہ مجھے پڑا ملا ہے۔ بھلا دیکھئے تو بھیجنے والا کون شخص ہے۔

احمد نواز۔ (رقعے کو پڑھکر) میں کیا جانوں کوئی تمہارا دوست ہوگا جس سے کہ تم نے تمام حال کہا ہوگا۔ میں نہیں جانتا۔ کہ اسمیں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔

عبدالستار۔ سو وہ تو تم ہی ہو۔ جو میرے ہمراز ہو۔ سوائے تمہارے کوئی نہیں۔ جس سے میری کھلم کھلی گفتگو ہو۔

احمد نواز۔ واہ بھئی خوب کہی جو سچی بات کہہ رہے ہیں۔ وہی چور۔ اس لئے تو کہتا ہوں۔ کہ آپ کا دماغ ٹھکانے پر نہیں۔ آپ باداموں کا استعمال کیجئے گا۔ کہ دماغ میں قوت آئے۔ اور سوچ سمجھکر بات دہان مبارک سے نکالیں۔

عبدالستار۔ احمد نواز کیوں چھیڑتے ہو واللہ میں نے اپنا راز دل کسی پر عیاں نہیں کیا بلکہ جہاں تک ہو سکا پرہیز ہی کیا۔ مگر سخت ہی حیرانگی کی بات ہے۔ کہ میں راز دل چھپا چھپا کر متواتر چوبیس گھنٹوں سے اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوں۔ پھر بھی راز فاش ہو گیا۔

احمد نواز۔ یہ تو میں عجیب بات سن رہا ہوں کہ باوجود اس قدر کوشش کے پردہ فاش ہو گیا۔ سوچو سمجھو خیال کرو۔ شاید تم نے کسی سے تھوڑا بہت کہدیا ہو۔

عبدالستار۔ میں قسمیہ عرض کرتا ہوں۔ کہ سوائے تمہارے میں نے کسی سے حال دل نہیں کہا۔ بلکہ کہتا کیسے۔ میری تو آپ ہی سے اسقدر کھلم کھلا گفتگو ہے باقی جسقدر یار آشنا ہیں۔ ان سے علیک سلیک کے کچھ تعلق نہیں۔

احمد نواز۔ خیر یہ تو سوچ طلب بات ہے۔ اسپر میں بھی غور کرونگا۔ تم بھی کرنا بعد میں جیسا سمجھ میں آویگا۔ عمل میں لایا جاویگا۔

عبدالستار۔ ہاں . . . مگر خدا کے لئے مجھے اس معشوقہ تک پہنچنے کی ترکیب تو بتائیں۔ واللہ میرے دل بیقرار میں عجیب الجھن سی پیدا ہو رہی ہے۔ آہ میں کیسا بدنصیب ہوں کہ شکل جاناں سے ابھی تک نا بلد ہوں۔

احمد نواز۔ کیوں گھبراتے ہو۔ کیوں گھبراتے ہو۔ بھلا میاں اسمیں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔ اور میں جو کچھ بھی سوال کروں۔ جواب ٹھیک دینا۔

عبدالستار۔ کیا مجال جو جھوٹ کہوں۔

احمد نواز۔ اچھا تو تمہاری اُن کے گھر میں آمدورفت بھی ہے یا نہیں۔

عبدالستار۔ آمدورفت ہوتی تو یہ فراق کی گھڑیاں کیوں نصیب ہوتیں۔ (آنسو نکل پڑے)۔

احمد نواز۔ ارے بھائی میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ مسٹر افتخار احمد کے ہاں بھی جایا کرتے ہیں یا نہیں۔

عبدالستار۔ جب وہ لاہور میں مقیم تھا اور میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ تب تو بیسیوں دفعہ میں اُن کے مکان پر جایا کرتا تھا۔ اور گھنٹوں بیٹھکر سکول کے بارے میں صلاح و مشورہ کیا کرتا تھا۔

احمد نواز۔ تم کس کلاس میں اُن کے ہم جماعت تھے۔

عبدالستار۔ شاید ۔ ۔ ۔ پانچویں جماعت میں۔ بعد میں وہ تو کلکتے چلے گئے۔ اور میں نے بھی سکول چھوڑ دیا۔ اور اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں جا داخل ہوا۔ جہاں آپ اور میں دونوں اکٹھے تعلیم پاتے رہے۔

احمد نواز۔ اچھا تو جو میں کہوں اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو۔

عبدالستار۔ ہاں ہاں۔ ہر طرح تیار ہوں۔

احمد نواز۔ دل و جان سے۔

عبدالستار۔ جان و مال سے۔

احمد نواز۔ اچھا تو جاؤ جتنے دن مسٹر افتخار احمد یہاں قیام پذیر ہیں اُن سے ملتے رہو۔ اور رابطہ اتحاد خوب ہی بڑھاؤ۔ اور اُن کی آمد کا ایک جلسہ خاص انھی کے مکان پر کرو۔

عبدالستار۔ مگر اس سے فائدہ۔

احمد نواز۔ کیسے فضول آدمی ہو۔ ارے بھائی ایسا کرنے سے تمہاری قدر افتخار تو افتخار اسکے والدین کے دل میں بھی اثر کر جاویگی۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آوے گی۔

عبدالستار۔ مگر یہ تو مدتوں کے کام ہیں۔ اور واللہ یہاں تو ایک لمحہ گذارنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

احمد نواز۔ تو کیا اس کو حلوا سمجھتے ہو۔ ادھر منہ میں ڈالا۔ اور ادھر نگل لیا۔ جبتک میرے کہنے پر عمل نہ کروگے۔ ہرگز درجاناں تک تمہاری رسائی نہیں ہوسکتی۔

عبدالستار۔ بہتر ہے۔ ابھی جاتا ہوں۔ بجا کیا ہے۔ (گھڑی دیکھکر) پونے بارہ۔ خیر اسوقت تو گھر میں ہی موجود ہوں گے۔

احمد نواز۔ چلو میں بھی چلوں۔ میرا بھی اُن سے انٹروڈیوس کرادیجئیگا۔

عبدالستار۔ ہاں خوشی سے چلیں۔

اتنا کہا اور ہر دو دوست کمرے سے نکلکر سیدھے بازار کی طرف روانہ ہوئے تھوڑی دور جاکر ایک خوش وضع مکان چار منزلہ کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ اور ہمارے ناول کے ہیرو نے نوکر سے کہا کہ مسٹر افتخار احمد کو اطلاع دو۔ کہ عبدالستار آرزوے دیدار رکھتا ہے۔

نوکر یہ سُن کر اندر گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد لوٹ آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ چلئے حضور یاد فرما رہے ہیں۔

یہ سُنتے ہی ہمارے دونوں دوست ستار و نواز لپک کر اندر گئے۔ اور جاتے ہی مسٹر افتخار احمد سے علیک سلیک کے بعد دست پنجہ لیا۔ اور کرسیوں پر بیٹھے ان کے بیٹھتے ہی مسٹر افتخار احمد نے نوکر کو گھنٹی کے ذریعے سے بلایا اور کہا۔

افتخار احمد۔ (دونوں دوستوں سے) کہیئے آپ سوڈا واٹر پئیں گے یا کہ چاے۔

عبدالستار۔ جی میں تو البتہ چائے کا عادی ہوں اور چائے ہی پیونگا۔ مگر آپ میرے کرمفرما دوست مسٹر احمد نواز سے پوچھئے۔

افتخار احمد۔ کہئے صاحب آپ کیا پئیں گے۔
احمد نواز۔ جناب عالی میں بھی عادی چائے کا ہوں۔ مگر اس وقت نہیں پیوں گا۔ کہ طبیعت خراب ہے۔
افتخار احمد۔ اجی واہ واللہ چائے تو ایسی فائدے مند چیز ہے۔ کہ بیان نہیں کر سکتا تھکاوٹ کا تو اس سے نام نہیں رہتا۔
احمد نواز۔ بہتر ہے۔ بندہ حاضر ہے۔
افتخار احمد۔ (نوکر سے) چھنو جاؤ۔ چائے لاؤ۔ مگر پیسٹری وغیرہ ضرور لانا۔ سنا ہے یا نہیں۔
چھنو۔ بہت بہتر حضور (سر کو جھکایا) اور چلدیا۔
افتخار احمد۔ (عبدالستار سے) جناب کی تعریف۔
عبدالستار۔ انہیں احمد نواز کہتے ہیں۔ اور آجکل بی۔ اے میں تعلیم پاتے ہیں میرے کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ اور میرے نہایت ہی مہربان دوست ہیں۔
افتخار احمد۔ میں بڑے فخر سے کہتا ہوں کہ میں بہت ہی خوش نصیب ہوں۔ کہ آپ جیسے قابل شخص سے تعارف ہوا۔ مسٹر عبدالستار میں آپ کی اس مہربانی کا تہ دل سے مشکور ہوں۔
احمد نواز۔ جناب میں کس لائق ہوں۔ بلکہ مجھے فخر کرنا چاہئے۔ کہ میرا راہ و رسم ایک خاندانی شخص سے ہو۔ میں بھی مسٹر عبدالستار کا مشکور ہوں۔
عبدالستار۔ اچھا صاحب اب ذرا کلکتہ کا حال سنائیں۔
افتخار احمد۔ کلکتہ کا کیا کہنا جس شخص نے کلکتہ دیکھ لیا۔ بس جناب یہ سمجھ لیں۔ کہ لنڈن ہی دیکھ لیا۔
احمد نواز۔ اچھا اگر زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ میں اور مسٹر عبدالستار کسی دن ضرور دیکھنے آوینگے۔
افتخار۔ سچ۔ واللہ ضرور آوینگے نا۔

احمد نواز۔ یقیناً حاضر خدمت ہونگے۔ مگر یہ تو بتائیں۔ کہ آپ کب تک تشریف لے جاویں گے۔

افتخار۔ ابھی تو دو ماہ تک یہاں ہوں۔

احمد نواز۔ دو ماہ تک بیشک ہمیں بھی موقعہ مل جائیگا۔

اتنے میں چھنو چائے لیکر حاضر ہوا پہلے اس۔ نے تینوں جنٹلمینوں کے آگے منقش میزیں رکھیں جسپر میتوس علیحدہ علیحدہ میزوں پر رکھے۔ جن میں چائے کے ساتھ نہائیت ہی عمدہ انگریزی مٹھائیاں تھیں۔ جن پر ہمارے نوجوان دوستوں نے مل کر کھانا پینا شروع کیا۔

قریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد فارغ ہو گئے۔ تو چھت کے روشن سے یہ آواز آئی۔ کہ اری او بسم اللہ موئی تو کہاں گم ہو جاتی ہے۔ پہروں انتظار کرو۔ پھر بھی تو نہیں دکھائی دیتی۔ آخر اسکا کیا سبب ہے۔ تیرا اگر کام کاج کو جی نہیں چاہتا۔ تو کیوں نہیں چلی جاتی۔ خیر آج ابا جان آئیں گے۔ تو ضرور تمہاری شکائیت کرونگی

جب یہ آواز ہمارے تینوں دوستوں کے کانوں میں آئی۔ تو سب چپ ہو گئے خصوصاً ہمارے ناول کے ہیرو ستار کی عجیب حالت ہو گئی۔ دل اس آواز ہی پر شیدا ہو گیا۔ اور دل نے گواہی دی۔ کہ ہو نہ ہو یہ سریلی آواز خوش کن آواز متوجہ دلنوازکی ہے۔

اس آواز کے ساتھ ہی ہمارے افتخار احمد تھوڑی دیر کے بعد لوٹ آنے کا وعدہ کر کے کوٹھے پر گئے۔ تو احمد نواز نے عبدالستار سے کہا۔

احمد نواز۔ کیوں بھائی تمہیں کیا ہوا۔ بیٹھے بٹھائے حالت دگرگوں کیوں ہو گئی ہے۔

عبدالستار۔ ہاں بھائی اس آواز نے خدا جانے کیا جادو کیا ہے کہ بس آواز ہی پر دل لٹو ہو گیا ہے۔

احمد نواز۔ (طنز سے) بھلا میاں یہ تو بتاؤ۔ آواز کس کی تھی۔

عبدالستار ۔ بھئی نواز خدا جھوٹ نہ بلائے۔ میری پیاری معشوقہ کی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ ایسا آواز خدا نے ضرور میری جان کی مالک ہی کو عطا فرمایا ہوگا۔ آہ........

آہ کا لفظ ابھی پورا ادا بھی نہ ہوا تھا۔ کہ ایک رشک حور چھت کے روشندان کے پاس کی الماری سے کچھ نکالنے آئی۔ اور اچانک ہاتھ سے کنجیوں کا گچھا گرا اور گرتے ہی روشندان سے نیچے آپڑا۔

کنجیوں کو دیکھنے کے لئے نازنین آگے بڑھی۔ اور سینے پر ہاتھ رکھکر نیچے جھکی۔ اور پوری طرح نیچے جھکنے بھی نہ پائی تھی۔ کہ قدرت نے عبدالستار سے آنکھیں دوچار کرادیں۔ شرم وحیا سے پسینے پسینے ہوکر پیچھے ہٹ گئی۔

ادہر ہمارا ہیرو جھٹ چلا اٹھا۔ کہ آج آفتاب زمین پر اتر آیا۔ اور قیامت آیا ہی چاہتی ہے۔ اور بے ہوش ہوگیا۔

مسٹر احمد نواز نے جب یہ حالت دیکھی۔ تو سخت ہی گھبرایا۔ کہ عنقریب معاملہ طشت از بام ہوا چاہتا ہے۔ اور دل میں کہنے لگا۔ کہ مسٹر افتخار احمد ابھی نہ آویں۔ کہ عبدالستار کو بے ہوش دیکھیں۔ خدا جانے کیا کیا اور کیسے کیسے وسوسے دل میں لاویں۔ خیر نہایت ہی تنگ و دو سے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں مسٹر افتخار احمد آن موجود ہوئے۔ اور اس حادثہ جانکاہ کو دیکھکر چلا اٹھے۔ کہ آئیں یہ کیا معاملہ ہے۔ ان کو یہ کیا ہوگیا۔

احمد نواز ۔ یہ مرض انکو اکثر ہوجایا کرتی ہے۔ آپ ہراساں نہ ہوں۔ ابھی دیکھئے ہوش آیا ہی چاہتا ہے۔ ہاں ذرا تھوڑا سا پانی منگوایئے۔

افتخار احمد ۔ یہ مرض تو اچھی نہیں۔ اسکا اچھی طرح علاج معالجہ کرنا چاہئے۔ دیکھئے تو رنگ کس قدر زرد ہوا جاتا ہے۔

احمد نواز ۔ جی صاحب اسقدر علاج کئے سکے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہت ڈاکٹروں کو دکھایا مگر یہ نامراد مرض لاعلاج مرض ثابت ہوئی۔ اس مرض سے تو میرے خیال

ہیں حضرت عیسےٰ بھی عاجز آجاتے۔
افتخار۔ اجی واہ ایسی کوئی مرض نہیں۔ جسکا کہ حکمار نے علاج نہ کیا ہو۔ جسکی دوا نہ تیار کی ہو۔
احمدؐ نواز۔ جناب عالی علاج میرے خیال میں بے سود ہیں۔ جبکہ میرے دوست کو صحت حاصل نہ ہوئی۔ ہاں ذرا پانی منگوائیے۔
افتخار احمد۔ (چھنو سے) چھنو تھوڑا سا گلاس میں پانی لاؤ۔
چھنو۔ بہت بہتر حضور۔
اتنا کہا اور جلدی سے پانی لاکر حاضر کیا۔ جیسے احمدؐ نواز نے عبدالستار کے منہ پر چھڑکا۔ تو قدرے ہاتھ ہاتھ پاؤں میں جنبش ہوئی۔ آہستہ آہستہ زردی بھی غائب ہونے لگی۔ آنکھوں میں بھی حرکت نمایاں ہوئی۔ اور بے اختیار ٹوٹے پھوٹے الفاظوں میں ناز... نین... نکل گیا۔ جیسے ہمارے دوست مسٹر افتخار احمدؐ نے سُنا۔ اور احمدؐ نواز سے پوچھا۔
افتخار احمدؐ۔ ہیں یہ نازنین کیا؟
احمدؐ نواز۔ (حواس باختہ کو درست کر کے تحمل کے ساتھ) اجی کچھ نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے۔ کہ عبدالستار ہوش میں آنے لگے ہیں۔ اسلئے انہوں نے مجھے پکارا ہے۔ چونکہ ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آئے۔ اسلئے میرا نام ادا نہیں کر سکے۔ واؤ کو اڑا کر ناز کا لفظ ادا ہو چکنے کے بعد طاقت گویائی نے جواب دیدیا۔ تو اوپر اور نیچے کے دانت آپس میں مل گئے۔ جس سے نازنین بن گیا۔ آیا خیال شریف میں۔
افتخار احمدؐ۔ جی ہاں خوب سمجھ لیا۔ واللہ میں تو حیران ہو گیا تھا کہ ہیں۔ یہ تو کسی خوبرو کے عاشق معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کے سمجھانے سے یہ مشتبہ خیال رد ہو گیا۔
اتنے میں ستار نے آنکھوں کو کھولا۔ اور ہمت کر کے بیٹھ گیا۔ تب دونوں دوستوں نے حال پوچھا۔ جسکے جواب میں ستار نے صرف یہ کہا۔ کہ اب تو خدا کا فضل ہے۔

اور چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مسٹر احمدؔ نواز بھی اُٹھا۔ اور بمشکل تمام اجازت طلب کی۔ اور چلدیئے۔ راستے میں احمدؔ نواز نے تمام حال کچا چٹھا کہہ سنایا۔ ستار نے جانثار دوست کا شکریہ ادا کیا۔ اور دونوں اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

خوب بچے

رات کے نو بجے کا وقت ہے۔ ماہتاب جہانتاب رات کی سیاہ چادر پر ہمجنس ستاروں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ تمام عالم اس کی خوش کن روشنی سے دل پژمردہ کو بشاش کر رہا ہے۔

اس وقت ہمارے دوست مسٹر افتخار احمدؔ کے مکان پر خوب ہی رونق ہے۔ آخر یہ رونق کیسی۔ کیا کسی کی شادی ہے۔ نہیں نہیں آج ہمارے ناول کے ہیرو نے اپنے دوست مسٹر افتخار احمدؔ کی دعوت دی ہے۔

چلیئے ناظرین ذرا ہم بھی اُنکی بزم سے تھوڑا حظ اٹھاویں۔

جب ہم نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ تو رکھتے ہی روشنی سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ روشنی کا وہ عالم ہے۔ کہ دن معلوم ہوتا ہے۔ ہال کمرے میں جھاڑ فانوس جگمگا رہے ہیں۔ اور چاروں دیواروں پر نہایت ہی عمدہ جھاڑ آویزاں ہیں۔ وسط ہال میں ایک چھ فٹ کی میز منقش دھری ہے۔ جسپر خوشنما پھولوں کے گلدستے قرینہ سے دھرے ہیں۔ جنمیں پھولوں کے درمیان بجلی لگا دی ہے جو جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ اس نظارہ کو دیکھکر گلزار ابراہیم یاد آگئی۔ کہ گلزار ابراہیم کا ایک ادنےٰ نمونہ مسٹر افتخار احمدؔ کے گھر میں ہنوز باقی ہے۔

اس ہال کی شرقی اور غربی دیواروں میں تین تین دروازے ہیں جنپر بجائے چک کے موتیوں کی جھالریں لٹک رہی ہیں۔

سیمنٹ ٹائیز کا فرش اس روشنی کی چکا چوند سے دوبالا ہو رہا ہے۔ اور دیوار

کی سبز و سرخ ٹائلیں اس شمع میں اپنا نمونہ آپ ہی بن رہی ہیں۔
چھت کچھ سے اسقدر منقش ہے۔ کہ سوائے بیل بوٹوں کے کچھ نظر نہیں آتا جسمیں ایک روشندان چھ فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا منقش لکڑی سے بنایا گیا ہے۔

آج تو واقعی مسٹر افتخار احمد کا مکان فردوس بریں بن رہا ہے۔ خیر شرقی دروازوں میں سے درمیان کے دروازے سے مسٹر عبدالستار و احمد نواز فراماں فراماں برآمد ہوئے۔ ناظرین والا تمکین میں اسوقت ناول کے ہیرو کے حسن لاثانی کی کیا تعریف لکھوں۔ قلم یہ طاقت ہی نہیں رکھتی۔ کہ حسن عبدالستار کا تھوڑا سا نقشہ کھینچ سکے۔ آج تو جناب خوب ہی بن ٹھن کر تشریف لائے ہیں۔ ہاں بھلا بن سنور کر کیوں نہ آتے۔ جب کہ انہوں نے اپنی معشوقہ دلنواز کے گھر میں رونق بخشی ہے۔ کیوں نہ وہ اپنا حسن اپنی معشوقہ حسن مہ جبین کو دکھائیں۔

خیر دونوں دوست بعد علیک سلیک کے کرسیوں پر جلوہ فرما ہوئے تو باقی دوستوں نے ان سے ہنسی و مضحقہ کرنا شروع کیا۔ قریباً پانچ منٹ کے بعد سب دوست خاموش ہوئے۔ تو انمیں سے ایک دوست جنکا اسم مبارک مسٹر فخر الدین تھا۔ اٹھے اور اس جلسے کی شان میں ایک نظم کہی۔ جو واقعی قابل تعریف تھی۔ جب وہ نظم ختم ہوئی۔ تو سب نوجوانوں نے ملکر نعرہ تحسین بلند کیا۔ اور نوجوان کی قابلیت کی داد دینے لگے۔

اس کے بعد ہمارے سیکنڈ ہیرو مسٹر احمد نواز صاحب اُٹھے۔ اور اس طرح گویا ہوئے۔

دوستو۔ عزیزو۔ بھائیو میں تھوڑا سا وقت آپ سب صاحبوں کا ضائع کرتا ہوں۔ امید ہے کہ از راہ نوازش مجھے اس بات کا شرف بخشیں گے۔ کہ میں کچھ التماس آپ کی خدمت میں عرض کروں۔
میں مسٹر فخر الدین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ انہوں نے کچھ دُرافشانی کی۔ خاصکر انہوں نے جو اشعار مسٹر افتخار احمد اور عبدالستار صاحب کی شان

میں کیے ہیں۔ قابل تعریف ہیں۔ بیشک ان کی داد دینی میری طاقت سے بعید ہے۔ میرا رونگٹا رونگٹا بھی اگر ان کی مدح خوانی میں مشغول ہو جاوے تو بھی انکی ہمدردی کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔

باقی رہا۔ اس جلسے کا قایم ہونا۔ اس جلسے کا قایم ہونا ایک بنا پر قایم ہے۔ میں آپ کو مختصراً عرض کئے دیتا ہوں۔ ہمارے کرمفرمائے دوست مسٹر افتخار احمد مسٹر عبدالستار کے کلاس فیلو رہ چکے ہیں کسی زمانے میں یہ ہم نوالا و ہم پیالا بھی تھے۔ اب بھی ہیں۔ مگر وہ بات نہیں۔ جو ہر وقت کی میل ملاپ سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ عرصہ تین سال سے مسٹر افتخار احمد کلکتہ میں اپنے چچا کے پاس مقیم ہیں۔ اور اب تین سال کے بعد انہوں نے لاہور کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشی ہے۔

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے۔ کہ جو دوست آپس میں عرصہ تک اکھٹے رہے ہوں بعد میں فلک کی کجرفتاری سے یوں جدا کئے جاویں۔ تو کیسا شاق گذرتا ہے یہی حال ہمارے مسٹر عبدالستار کا تھا۔ اور جب ہمارے عالی وقار مسٹر افتخار احمد صاحب لاہور سے تشریف لے گئے تھے۔ تو مسٹر عبدالستار کو ایک عزیز دوست کا جدا ہونا سخت ہی ناگوار خاطر ہوا۔ اسی دن سے مشن ہائی سکول سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ مسٹر افتخار احمد کے نہ ہونے سے سخت ہی اُداس رہنے لگے۔ چنانچہ دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ جسطرح ہو سکے سکول کو خیرباد ہی کہنا چاہئے۔

چنانچہ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے والد بزرگوار سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ جنہوں نے ان ہی کی مرضی پر چھوڑا۔ تب انہوں نے مشن ہائی سکول سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اور اسلامیہ سکول شیرانوالہ گیٹ میں آن داخل ہوئے۔

چونکہ ان کی طبیعت کا میلان پڑھائی کیطرف بہت تھا۔ اس لئے انہوں نے چندہی یوم میں تمام سکول میں شہرت حاصل کر لی اور رفتہ رفتہ اُن کا اور میرا تعارف زیادہ ہوتا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ مجھے اور انکو ایک دوسرے سے جدا ہونا گویا قیامت معلوم ہوتی تھی۔

باوجودیکہ ہمیں بہت سخت محبت تھی۔ مگر پھر بھی اکثر مسٹر افتخار احمد کا نام لیکر دل ہی دل میں مزا لیا کرتے تھے۔ ان کو میں نے اکثر دیکھا۔ کہ مسٹر افتخار احمد کا فوٹو ہاتھ میں لئے ہوئے دل کو ڈھارس دیتے تھے۔ اور بعض موقع پر ہائے افتخار کا کلمہ بے چین دل سے نکل جایا کرتا تھا۔ جس وقت ہم کو ذرا بھی فرصت ہوتی۔ تو سوائے اُن کے تذکرے کے اور کچھ سروکار نہ تھا۔

میں بھی مسٹر افتخار احمد کا غائبانہ مشتاق تھا۔ خدا کرے کہ افتخار احمد صاحب جلدی تشریف لاویں۔ کہ میں بھی اُن کی خوش الحانی سے دل بیقرار کو تسکین دوں۔ سو خدا نے میرا گوہر مقصود مجھے عنایت فرمایا۔ کہ میں آج اپنے آپکو مسٹر افتخار احمد کے قدوم میمنت لزوم میں دیکھ رہا ہوں۔

آپ سب صاحبوں نے سمجھ لیا ہوگا۔ کہ یہ جلسہ کیسا ہے۔ یہ مسٹر افتخار احمد کی دعوت دیگئی ہے۔ کہ بعد مدت کے لاہور تشریف لائے ہیں۔ اس دعوت کو قایم کرنے والے ہمارے مسٹر عبدالستار ہیں۔

اتنا کہہ کر مسٹر احمد نواز صاحب بیٹھ گئے۔ تو مسٹر افتخار احمد نے اس طرح کہنا شروع کیا۔

میں مسٹر عبدالستار کی اس تکلیف کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ ہنوز سابق محبت اُن کے آئینہ دل میں نقش ہے۔ اور روز روشن کیطرح بدستور روشن رہے۔ جناب جو کچھ مسٹر نواز احمد صاحب نے فرمایا ہے۔ بالکل صحیح ارشاد فرمایا ہے۔ واقعی ہم آپس میں بھائیوں سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔ بلکہ کئی دوستوں کو رشک آتا تھا اور ہم میں نفاق ڈلوانا چاہتے تھے۔ خاصکر ایک شخص تو ہمارے در پئے آزار ہو گیا۔ خدا جانے کہ اس کے دل میں یہ خیال فاسد کیوں سما گیا بیشک مسٹر عبدالستار کلاس میں اول تھے۔ شاید یہی سبب اُس کے بغض کا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ماسٹر صاحب نے ایک مضمون دیا جسمیں کہ انہوں نے ایک کتاب انعام پر مقرر کی۔ ہمارے حاسد دوست (میں اس کا نام لینا پسند نہیں کرتا) نے کسی

سے مضمون تیار کروایا۔ تو کپڑوں میں پھولے نہ سمائے تھے۔ اور ہر ایک سے تعریف کے پُل باندھتے تھے۔ مگر صاحبان جو بادل گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

خیر ہمارے معزز دوست مسٹر عبدالستار صاحب نے بھی ایک مضمون تیار کیا۔ جو واقعی قابل تعریف تھا۔ میں اُس دن سے اُن کے دماغ پر عش عش کرنے لگا جب موقعہ پڑھنے کا آیا۔ تو ہمارے حاسد دوست نے بڑے غرور کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ مگر افسوس کسی نے داد نہ دی۔

پھر میرے بے حد اصرار سے مسٹر عبدالستار نے نہایت ہی ملائمت سے کہنا شروع کیا۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی۔ اُن کے ہر ایک لفظ پر نعرہ ہائے واہ واہ بلند ہوتا تھا۔ اور تمام سکول اُن کے مضمون پر انگشت بدندان تھا۔ ہر طرف سے نعرۂ تحسین سنائی دے رہا تھا۔ میرے خیال میں یہی سبب اُن کے حسد کا تھا۔

میرے معزز دوستو۔ مجھے بھی بے شک مسٹر عبدالستار سے محبت ہے۔ محبت بھی وہ محبت جو کہ ایک دوست کو دوست کے ساتھ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ میں یہ سُن کر نہایت ہی خوش ہوا ہوں۔ کہ مسٹر عبدالستار کو ابھی تک دوستانہ اُلفت ہے۔ میں اُن کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اس محفل کے گرم کرنے کا بھی بجید مشکور ہوں۔

یہ کہہ کر ہمارے مسٹر افتخار احمد صاحب بیٹھ گئے۔ تو سب دوستوں نے مسٹر فخرالدین کو جنہوں نے پہلے ایک نظم پڑھی تھی۔ ایک غزل کہنے کے لئے مجبور کیا۔ چنانچہ انہوں نے خوب ہی لے بٹھا کر یہ غزل کہنی شروع کی۔

غزل

اُلفت میں نازنین کی ہی تلملا گئے دل — فرقت میں زار زار ہے مجھکو رولائے دل

دل ملگیا ہے ظالم اظلم سے دیکھئے — شاید کہ قبر کا مجھے کو نہ دکھائے دل

کندہ ہماری سنگِ لحد پہ کیجیو — مرجائے پر کسی سے نہ کوئی لگائے دل

رسوا و خستہ حال کیا در بدر کیا آگے یہ مجھکو دیکھئے کیا کیا دکھائے دل

وہ مہ جبین جو حشمت کو لگائے سینے سے
مثل گل گلاب کے یہ کھل کھلائے دل

مسٹر فخر الدین صاحب جب یہ غزل گا چکے۔ تو ہر طرف سے نعرہ تحسین بلند ہوئے خاصکر عبد الستار صاحب سے تو بیحد واہ واہ کے نعرے بلند کئے۔ اور اُنکی اس غزل سننے سے طبیعت حد درجہ بیقرار ہو گئی۔ اور نہیں یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ شاعر نے بالکل انہی کا نقشہ غزل میں کھینچ دیا ہے۔ آخر اسقدر بیقرار ہوا۔ کہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ اور ایک جگہ چھپ کر خوب ڈھاڑھیں مار مار کر رونے لگا جب کچھہ افاقہ ہوا۔ تو دربان سے کہا کہ مسٹر احمد نواز کو بلا دو۔ چنانچہ پل میں مسٹر احمد نواز صاحب کو بلا لایا۔ تو مسٹر عبد الستار نے کہا۔

عبد الستار۔ بھائی نواز اب تو واللہ میں اس بزم میں نہ جاؤنگا۔ میرا دل از حد بیقرار ہو رہا ہے۔ ہائے۔ اے نازنین تو کہاں ہے۔ آ دیکھ تیرا عاشق نیم جان ہے۔

احمد نواز۔ بھائی ستار۔ کیا دیوانے ہو۔ ہوش کرو۔ اس وقت محفل سے نکل جانا ٹھیک نہیں۔ تمام دوستوں کو شک ہو جائے گا۔ خدا کے لئے دیوانے نہ بنو۔

عبد الستار۔ ارے بھائی میرا دل بے چین ہوا جاتا ہے۔ افسوس تمام دوست اس غزل کی فرمائش نہ کرتے اگر کی تھی۔ تو یہ غزل ہی دل کو چیر کے دینے والی مسٹر فخر نہ پڑھتے۔ ہائے میں کیسا بد نصیب ہوں۔ کہ میری رسائی جاناں تک نہیں ہو سکتی۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

احمد نواز۔ بھائی ایسے نڈھال نہ ہونا چاہئے۔ اگر تمام دوستوں کو خبر ہو جائے گی۔ تو بنا بنایا کام بگڑ جا . . . .

ابھی جا کا لفظ پورا مسٹر احمد نواز ادا نہ کرنے پائے تھے۔ کہ ایک بدصورت آدمی لمبا ناک لمبی لمبی بے سُری سی مونچھیں۔ چپٹا چہرہ۔ سُرخ آنکھیں دہیں

سے نمودار ہوا۔ اور یہ کہتا ہوا غائب ہوگیا۔ کہ تمام بنابنایا کام ضرور بگڑیگا۔ اگر دبگڑا تو میں ضرور بگاڑونگا۔ خوب ہوشیار رہو۔

وہ شخص تو غائب ہوگیا۔ اور دونوں نوجوان حیرت وخوف سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اتنی جرات نہ پڑی کہ اس شخص کا پیچھا کریں۔ خصوصاً ہمارے مسٹر عبدالستار پر تو ایسا رُعب چھا گیا۔ کہ بُت بیجان کیطرح کمرے کا کھڑا رہگیا۔ اگر اسوقت احمد نواز نہ ہوتا۔ تو ضرور عبدالستار چِلّا اُٹھتا۔ آخرکار اس خاموشی کو احمد نواز سے توڑا۔

احمد نواز۔ بھائی یہ کیا بلا ہے۔ واللہ مجھے تو اس کے چہرے کیطرف دیکھکر خوف ساطاری ہوگیا تھا۔

عبدالستار۔ خاموش خاموش کہیں حرامزادہ پھر نہ آجائے۔ واللہ بڑی ہی ڈراؤنی شکل تھی۔ مونچھیں کس قدر دراز تھیں۔ مگر یار معلوم نہیں کہ کون ہے۔

احمد نواز۔ خدا جانے کون بے ایمان۔ چیلا شیطان تھا۔ اجی یہ تو عجب سا آدمی تھا۔ اسکو کیوں اسقدر ہمارے ساتھ دشمنی ہے۔ ہاں ہاں شاید وہ رقعہ بھی اس دن والا اسی عجیب الخلقت نے تمہاری میز پر رکھا ہوگا۔

عبدالستار۔ ناممکن۔ ناممکن۔ میری میز پر تو چڑیا نہیں پھڑک سکتی۔ بھلا اس حرامی کا کیا مقدور تھا۔

احمد نواز۔ ارے میاں ایسے آدمی ضرور پہنچ جایا کرتے ہیں۔

عبدالستار۔ بھائی سچ پوچھو۔ تو اب مجھے مایوسی اپنا منحوس چہرہ دکھارہی ہے۔ آگے تو کسی کسی وقت امید کی کرن میرے دلمیں پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ مگر اس حرامزادے بدمعاش نے تمام پر پانی پھیر دیا۔ آہ نواز حال دل ابتر معلوم ہو رہا ہے۔ بھئی اگر چند یوم یہی حال رہا۔ تو یقیناً جان سے ہاتھ دھونے پڑنگے افسوس اس زمانے میں میرے لئے بھی دوسرا حاتم طائی پیدا ہوتا۔ کہ مجھے بھی وصلِ جاناں سے شاد و بامراد کرتا۔

احمد نواز - کاش کہ خدا تمہیں صبر عنایت کرتا۔ کہ تو دیوانہ نہ بنتا۔ بیشک حاتم طائی کی طرح تجھے منزل مقصود تک پہنچاتا۔ مگر افسوس تیرے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ چکی ہے۔ اچھا کچھ فکر نہیں۔ ضرور تیری حسن بانو تک میں تجھے پہنچاؤنگا۔ مگر بھائی خیر شامی کیطرح تمہیں بھی صبر سے کام لینا پڑے گا۔

عبد الستار - آخر بھائی بغیر صبر کے اب چارہ ہی کیا ہے۔ خبردار اپنے دل ناشاد پر صبر کرنا پڑیگا۔ کاش کہ میں اس سے پہلے کسی بُت خوبرو کا عاشق زار ہوتا۔ اس جہان فانی سے کُوچ کر جاتا۔ افسوس منہ مانگی مراد کی بجائے موت بھی نہیں آتی۔

احمد نواز - افسوس صبر کا وعدہ بھی کرتے ہو۔ اور پھر وہی کام۔ کہاں تک تمہیں سمجھاؤں میرا تو واللہ دماغ بھی خالی ہوا جاتا ہے۔

یہی سچ بات ہے۔ اگر صبر کروگے۔ تو تمہارے کام کے لئے کمر ہمت باندھونگا۔ بغیر اس کے میں ہرگز اپنی جان جوکھوں میں نہیں ڈال سکتا۔ خفا نہ ہونا ادھر آپ بے صبر ہو کر جان گنوادیں اور اُدھر میں کوشش کرکے زندگی برباد کروں بھلا اس سے کیا فائدہ ہوگا۔

عبد الستار - بجا فرمایا۔ مگر کوئی ترکیب ملاقات کی بھی سوجھی ہے یا نہیں۔

احمد نواز - خاموش۔ تم سب کچھ میرے پر چھوڑ دو۔ میں خود سنبھال لونگا ہاں ذرا اب اندر تشریف لے چلیئے۔ دوست انتظار کرتے ہونگے۔

عبد الستار - چلو بھائی۔ اتنا کہا اور پہلے احمد نواز اور پیچھے عبد الستار اندر کو روانہ ہوئے۔ اور جب مسٹر عبد الستار اندر قدم رکھنے ہی کو تھے۔ کہ کسی نے اُنکا بازو پکڑ لیا۔ اچانک بازو پکڑا جانے سے تمام حواس باختہ ہو گئے۔ خون خشک ہو گیا اور خیال گذرا۔ کہ ضرور وہی بدمعاش کمینہ سڑک میں ہوگا۔ دل پر نہایت ہی جبر کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سُنا۔ کہ آؤ ذرا میری بات سن لو۔ پھر اندر تشریف لے جایئے گا۔

پہلے تو عبد الستار نے انکار کی ٹھانی۔ مگر پھر خیال گذرا۔ کہ عین ڈیوڑھی میں

ہوں۔ تمام آواز اندر جائیگا بہتر ہے۔ کہ اسکے ساتھ چلوں۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائیگا
اتنا خیال آتے ہی اس کے ساتھ ہوئے۔ تھوڑی دور جاکر وہ سیاہ پوش ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ اور ستار کو کہا۔ کہ یہاں کھڑے ہوجاؤ۔

بیچارہ ستار بھیگی بلی کیطرح دبک کر کھڑا ہوگیا۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ کہ ضرور کوئی نئی آفت آیا چاہتی ہے سنتے ہیں وہ سیاہ پوش گویا ہوا۔

سیاہ پوش۔ ہاں بھلا یہ تو بتاؤ۔ کہ تم کس پر عاشق ہو۔ دیکھو ٹھیک ٹھیک بتانا ورنہ تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔

عبد الستار۔ تمہیں اس سے کیا مطلب ہے۔

سیاہ پوش۔ کچھہ مطلب ہوگا۔ تو کہا ہے۔ ورنہ کیا ضرورت تھی کہ تمہیں یہاں تک لایا جاتا۔ سوال کا جواب جلدی دو۔

عبد الستار۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ تم کون ہو جو مجھ سے پوچھنے کے حقدار ہو۔

سیاہ پوش۔ (ذرا ترش رو ہوکر) کیا نہیں بتاؤ گے۔ تم میرے پنجے میں ہو۔ اب یا تو تمام ماجرا بلا کم و کاست کہہ ڈالو۔ یا موت کی ناقابل برداشت مصیبت جھیلنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ سُنا ہے یا نہیں۔

عبد الستار خاموش رہتا ہے۔

سیاہ پوش۔ کیوں بے خاموش کیوں ہے۔ بتائیگا یا نہیں سو دیکھ یہ شئے تیرے سینے میں ابھی پیوست ہوا چاہتی ہے۔ جلدی بولو۔ جلدی بولو۔

جب عبد الستار نے ایک چھری اندھیرے میں چمکتی دیکھی۔ تو ملک الموت کا فوٹو آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ تو یقین ہوگیا۔ کہ اب آخری وقت ہے۔ ملک الموت عنقریب روح قبض کیا چاہتا ہے۔ خیر افسوس دنیا سے نامراد ہی چلے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ (باواز بلند۔ ہاں جلدی روح قبض کردیں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم مجھے اس آزار عشق سے خلاصی دلواؤ گے۔ اُف رے ظالم دل اگر میرا اختیار ہوتا۔ تو تمہیں چیر کر باہر پھینک دیتا یہ رسوائی کی موت تیرے

ہی سبب سے مجھ پر آئی - ورنہ میں کب اس نازنین پر مائل ہوتا جسکی کہ شکل و صورت سے بھی نابلد ہوں - ہاں میاں سیاہ پوش تمہیں میرے قتل کرنے میں تامل نہ کرنا چاہئیے مگر اس سے پہلے کہ تو مجھے قتل کرے - میرا ایک پیغام دلبر تک پہنچا دینا - کہ میں اگست ۱۹۲۲ء کو اسٹیشن پر تیری انگشت مہندی دیکھکر عاشق ہوا - اور آج تیرے عشق میں اس جہان فانی سے کوچ کرنے لگا ہوں - اے رات کی سیاہی تم بھی گواہ رہنا - کہ اس کا عاشق صادق ہوں - اے در و دیوار گواہ رہو میری حالت زار پر شاید وہ ادہر آنکلے تو کہدینا کہ تیرا عاشق تیرے عشق میں اس جگہ جان سے گذر گیا - بس میرے سیاہ پوش دوست اسقدر میرا پیغام پہنچا دینا - ہاں تو اب تمہیں میرا کام تمام کرنا چاہئیے دیر نہ کرو - لو میں لیٹ جاتا ہوں -

اتنا کہا اور مسٹر عبدالستار لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں -

ایک - دو - تین - چار - پانچ منٹ گذر گئے - مگر انکے گلے پر کسی نے چھری نہ پھیری سخت بیقرار ہوا - کہ قاتل نے اتنی دیر کیوں لگا دی - اکتا کر چلائے - ادہر مجھے آزار عشق سے رہائی دلوانیوالے دوست جلدی کر - کیوں دیر لگاتا ہے - پھر بھی کسی نے قتل نہ کیا - آخر دل میں اکتا کر آنکھیں کھول دیں - آنکھوں کا کھولنا تھا - کہ ماہتاب کا سامنا ہوا - حیران ہوا - کہ یہ کیا اسرار ہے - کہیں میں طلسم میں گرفتار تو نہیں ہو گیا - چاند سا چہرہ جو کہ اس رات کی سیاہی میں چمک رہا تھا - اور قدرے تبسم بھی نمایاں تھا - دیکھکر حیران و ششدر ہو گیا - کہ وہ سیاہ پوش کیا ہوا - اور یہ رشک حور کہاں سے نمودار ہو گئی - تو بے اختیار بول اٹھا -

عبدالستار - ہیں تم کون -

نازنین - تمہاری غلام -

عبدالستار - میں اسکا مطلب نہیں سمجھا -

نازنین - تمہارا نخل امید ہرا کرنیوالی -

عبدالستار - اور وہ سیاہ پوش کیا ہوا -

نازنین۔ بس ہمیشہ کے لئے گیا۔
عبدالستار۔ آہ کیا کہا۔ افسوس میرا ہمدرد میرا رفیق مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ آہ
میں کہیں کا نہ رہا ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادہر کے رہے نہ اُدہر کے رہے

میں نے سمجھا تھا۔ کہ مجھے میرا رفیق آزار غم سے نجات دلائیگا۔ مگر افسوس امید
خاک میں مل گئی۔ افسوس۔ مجھے اس نازنین سے الفت ہوتی جاتی ہے۔ کیا کروں
یہ کہاں سے آگئی۔ کہ میرا دل بے اختیار اس نازنین کیطرف کھچا جاتا ہے نہیں
نہیں ہرگز نہیں۔ یہ دل اُسی نازنین کا ہے جسکا ماہ اگست کی اکیسویں تاریخ کو
ہو چکا تھا۔ اس پر اب کوئی اور قبضہ نہیں کر سکتا۔ اے دل۔ یہی تیرا عشق ہے
کہ اس نازنین کیطرف سے ہٹ کر اس کافر ادا کی طرف مائل ہوا جاتا ہے۔ شرم
شرم۔ تو چاہے اس طرف کھچا جا۔ مگر میں ہرگز نہ مانونگا۔ افسوس میرا اختیار نہیں
کہ تمہیں چیر کر باہر پھینکدوں لو پھیر نازنین سے۔
عبدالستار۔ پیاری نازنین تم یہاں کس لئے تشریف لائیں۔ اور کس لئے
مجھے اپنا جلوۂ دیدار دکھانے آئیں۔
نازنین۔ اپنے چور کو دیکھنے کے لئے۔
عبدالستار۔ کونسا چور۔
نازنین۔ وہی جس نے مجھ پردہ نشین کے دل کو چرالیا ہے۔ اور مجھے اس
بیحیائی پر مجبور کیا ہے۔
عبدالستار۔ میں بھی تو سنوں۔ کہ وہ کونسا چور ہے۔
نازنین۔ بس جسکو میں نے پالیا۔
عبدالستار۔ (اِدہر اُدہر دیکھکر) کِسکو تم نے پالیا۔
نازنین۔ جس نے میرے دلکو چرالیا تھا۔
عبدالستار۔ یہاں تو سوائے تمہارے اور میرے وحشی تن کے اور کوئی نہیں

پھر چور کہاں ہے۔

نازنین۔ چور بس میرے سامنے کھڑا ہے۔

عبدالستار۔ ایں۔ میں چور (گردن جھکالی)

جب گردن اٹھا کر دیکھا۔ تو وہاں اس چاند سے مکھڑے کو نہ پایا۔ حیران ہوا۔ کہ کیا کوئی پری تھی۔ کہ ایک دم پرواز کر گئی۔ یا زمین کھا گئی۔ بہت تجسسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر نازنین کا کہیں سُراغ نہ پایا۔ اُکتا کر دوڑنا شروع کیا۔ مگر ہائے کہیں اُس نازنین کا سراغ نہ ملا۔ آخر بیقراری کی حالت میں پھرتا پھرتا ایک طرف چلا۔ تھوڑے قدم گیا ہوگا۔ کہ ایک آواز پیدا ہوئی۔

امید رکھو اور انتظار کرو۔

اس آواز نے چوکنا کر دیا۔ اِدہر اُدہر دیکھا۔ مگر کچھ پتہ نہ لگا۔ آخر بیقرار ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اور بیہوش ہوگیا۔

ادہر ہمارے سیکنڈ ہیرو احمد نواز نے جب مسٹر عبدالستار کو نہ پایا تو خیال گذرا کہ شاید کچھ کام ہوگا۔ کہ واپس لوٹ گئے۔ آخر آدھ گھنٹہ بھی گذر گیا۔ پھر تو شک پیدا ہوا۔ کہ ستار کا اتنی دیر غائب رہنا خالی از علت نہیں۔ ضرور کچھ بات ہے یہ خیال کر کے دوستوں کو کہا کہ آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی حاضر خدمت ہوتا ہوں۔

سب دوست۔ بڑی خوشی سے مگر ستار صاحب کہاں ہیں۔

احمد نواز۔ کسی کام کو گئے ہونگے۔

یہ کہتے ہی باہر چلدیئے۔ بہت آوازیں دیں۔ کہ عبدالستار عبدالستار۔ مگر سوائے اپنی آواز کے جو مکانوں سے ٹکرا کر واپس آتی تھی۔ کچھ سنائی نہ دیا۔ آخر مجبوراً ایک طرف کو چلدیئے۔ تھوڑے ہی قدم گئے ہونگے۔ کہ ایک نرم شئے سے ٹھوکر لگی۔ اُسکو ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ مگر سب بے سود ثابت ہوئی۔ آخر جیب سے دیا سلائی نکالکر جلائی۔ تو دیکھا۔ کہ مسٹر عبدالستار بے حس و حرکت پڑے ہیں ہاتھوں کے

طوطے اُڑ گئے۔ طاقت نے جواب دیدیا۔ سر چکرانے لگا۔ گر ہمت کو ہاتھ سے نہ جانے
دیا۔ نبض دیکھی تو وہ قدرے متحرک تھی۔ اٹھا کر سیدھا افتخار احمدؔ کے گھر میں
لائے۔ وہاں یہ ماجرا دیکھکر سب لوگ انگشت بدنداں ہوئے۔ عشرت کدہ غم کدہ
بن گیا۔ اور ستار کو میز پر لٹا کر الکٹرک فین (بجلی کا پنکھا) پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ اور
آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بولا یار نواز ستار کو کیا ہو گیا
احمدؔ نوازؔ۔ خدا جانے۔ میں کوچے سے گذر رہا تھا۔ کہ بیہوش پڑے ملے ہیں۔
دوسرا۔ آخر سبب
احمدؔ نوازؔ۔ سوائے اسکے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ کہ انکو مرض بیہوشی ہے۔ آہ اب
یہ مرض گھر کر گئی ہے۔ بہت علاج معالجے کئے مگر سب بے سود ثابت ہوئے۔

اسی اثنا میں کوٹھے سے ہائے ہائے کی آواز بلند ہوئی سب نوجوانوں کی آنکھیں
چھت پر لگ گئیں خصوصاً مسٹر افتخار احمدؔ تو بے چین ہو گئے۔ جھٹ کوٹھے پر
گئے۔ دیکھا کہ انکی ہمشیرہ فرش زمین پر بیہوش پڑی ہیں۔ یہ ماجرا دیکھکر حیران ہوئے۔
کہ یہ کیا اسرار ہے۔ ادہر میرے دوست عبدالستار بیہوش پڑے ہیں۔ اُدہر میری
ہمشیرہ۔ خیر اپنی امی جہاں آراؔ کو بلا یا دیگر اپنی ہمشیرہ کو پلنگ پر لٹایا اور ماما بسم اللہ
کو پنکھا جھلنے کی تاکید مزید کی۔ اور غمگین چہرہ بنائے ہوئے نیچے آئے۔ تو دوستوں
نے اس ماجرے کی نسبت پوچھا جسکے جواب میں یہ کہا۔ کہ دوستو۔ آپ شوق سے
یہاں رنگ رلیاں منائیں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ کہ جلسہ برخواست کر دیا جائے
مگر میں ایک اچانک حادثے سے اس محفل میں شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ تمام
حال سے اپنے دوستوں کو آگاہ کرتا مگر چونکہ معاملہ خانگی ہے۔ اسلئے قاصر ہوں۔

اتنا سنتے ہی سب دوست کھڑے ہو گئے اور جلسہ برخواست کرنے کی تیاری
کرنے لگے۔ سب کی رائے سے مسٹر احمد نواز نے عبدالستار کو کندھے پر اٹھا لیا۔
اور اُن کے گھر کی راہ لی۔ آہ آہ اب وہ عشرتکدہ جسمیں کہ چند منٹ پیشتر رنگ
رلیاں منائی جا رہی تھیں۔ غم کدہ بن گیا۔ افسوس یہ فلک کج رفتار کبھی کسی کو

چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ؎

یہ اک جا کسی کو بٹھاتا نہیں
کسی کا وصل اسکو بھاتا نہیں

بیقراری

اس واقعہ کے ایک مہینہ بعد کے واقعہ کو ہم قلمبند کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے درمیان کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔

اُف اُف دنیا میں کوئی اپنا نہیں۔ جدھر دیکھو بیگانے ہی نظر آتے ہیں۔ آہ وہ سہیلیاں جو منہ کا نی روٹی کھاتی تھیں۔ کنارہ کش ہو گئی ہیں۔ کہ کبھی ہم سے راہ ورسم ہی نہیں۔ آہ اس دنیائے ناپیدا کنار میں سب مطلبی ہی نظر آتے ہیں۔ اب تو خوب آزما لیا۔ کہ دنیا مطلب پرست ہے ؎

بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ میگردد

افسوس کیا معلوم تھا کہ مجھ بدنصیب پر ایک نئی آفت آنے والی ہے۔ جسکا کہ کبھی خواب و خیال نہ تھا۔ ہائے میں حال دل کس سے کہوں۔ کوئی ہمدرد و رفیق نظر نہیں آتا۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی بدرجہا بہتر ہے۔ آہ ظالم نہ تیرا ٹھکانہ معلوم اور نہ ہی اتنی طاقت کہ معلوم کرسکوں۔ بھلا میں ایک پردہ دار خاتون ہو کر کیسے تیرا پتہ و نشان دریافت کرسکتی ہوں۔ خدا کے لئے ایکدفعہ تو دیدار کی ایک جھلک سے میرے دل پژمردہ کو مسرور کر۔

اے دل کیا بتاؤں کہ تیرے ہاتھوں میں کس مصیبت میں گرفتار ہو رہی ہوں خدا کے لئے سنبھل۔ انجان نہ بن۔ کیا ایک غیر آدمی کیطرف مائل ہوا جاتا ہے۔ بھلا ایک نامحرم کا تجھ سے کیا تعلق۔ واللہ ذلیل نہ کر مان جا۔ مان جا۔

مجھ کم بخت کی حالت زار پر رحم کر۔ آہ آہ جسقدر رحم رحم پکارتی ہوں۔ اتنا ہی زیادہ بیقرار کئے جارہا ہے۔ اور اس بُت خوبرو کا چہرہ میری نظروں کے سامنے پیش کئے جارہا ہے۔ تاکہ میں اُسکے خیالی فوٹو کو دیکھکر تجھہ سے کسی قسم کا تعرض نکروں۔ آہ میرے سے بھی اس کے حسن خداداد کی داد لینا چاہتا ہے۔ بیشک وہ حسین ہے میں کب اس بات سے منکر ہوں۔ مگر اس کا حُسن اُسے مبارک رہے۔ تو کیوں مجھے خواہ مخواہ تنگ کررہا ہے۔ اُف رے بدقسمتی کہ میں تو اس کے لئے یہاں جان دے رہی ہوں۔ مگر اُسے کچھہ معلوم نہیں۔ کہ ایک بدنصیب مجھہ پر جان و تن سے فدا ہوئی جاتی ہے۔

خیر اگر میرا جذبۂ دل راست ہے۔ تو ضرور میرا محبوب دورئیے عشق سے بندھا ہوا چلا آئیگا۔ ع

کچے دھاگے سے چلی آئیگی سرکار بندھی

اپھر خودہی) اے حُسن افروز کیا پاگل ہے۔ دیوانی ہے۔ بھلا بغیر دیکھے بغیر جان پہچان وہ یہاں کیسے قدم رنجہ فرما سکتا ہے۔ ہاں اگر اُسکا کچھہ مجھ سے راہ و رسم ہوتا۔ تو شاید بھولے سے اِدہر آنکلتا۔ مگر اب تیری یہ آہ وزاری کب کسی کام آسکتی ہے۔ جبکہ وہ تجھے جانتا بھی نہیں۔ آہ کوئی ترکیب نہیں کہ اس کی خوشنما صورت دیکھہ سکوں۔ ہر طرف یاس و ناامیدی اپنا منحوس چہرہ دکھارہی ہے۔ افسوس میرے لئے تو تمام جہان تاریک ہے۔ جبکہ وہ ثانئے آفتاب میرے پاس موجود نہیں آہ اسوقت صفیہ خانم ہوتی تو ضرور مجھے اس آزار سے رہائی دلانے کی سعی کرتی۔ مگر افسوس قسمت نے اُسے پہلے ہی سے جدا کر رکھا ہے۔ باقی رہیں شیریں زبیدہ یہ تو اب پر کھلی گئیں۔ کسوٹی اُلفت میں جھوٹی ثابت ہوئیں۔ ذرا مجھے عشق میں مبتلا دیکھا تو جھٹ کنارہ کش ہوگئیں۔ کہ بدنامی نہ ہو خیر پرواہ نہیں ؎

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے
بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے

اتنے میں ماما بسم اللہ نیچے سے بھاگی ہوئی آتی ہے اور چلا اٹھتی ہے۔

ماما۔ حضور نیچے (زور سے کھانسنے لگتی ہے۔)

حسن افروز۔ کچھ کہو بھی کیا ہے۔ موئی دیر لگا رہی ہے۔

ماما۔ لمبے لمبے سانس لیکر جعور (حضور) نیچے... صفیہ... تشریف... لائی ہیں۔

حسن افروز۔ آئیں کیا کہا۔ صفیہ صفیہ خدا کے واسطے سچ کہو۔ کیا واقعی نیچے صفیہ تشریف لائی ہیں۔

ماما۔ کیا مجال جو جھوٹ عرض کروں۔

حسن افروز۔ بہتر ہے انکو جلدی اوپر لاؤ۔

ماما۔ جعور آتی ہی ہوں گی۔ مگر چھوٹی بیوی آپ ان دنوں ملول سی رہتی ہیں خیر تو ہے

حسن افروز۔ نہیں ماما بیمار تو نہیں ہوں۔ البتہ آج کل طبیعت خراب رہتی ہے۔ نہیں جانتی کہ کیا باعث ہے۔

ماما۔ بلائیں لیکر۔ قربان جاؤں۔ میں چھوٹی بیوی کے خدا کرے کہ پہلے کی طرح بشاش نظر آویں۔

نازنین کو ان الفاظوں نے سخت ہی چوٹ لگائی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے اپنے تئیں سنبھالا اور کہا۔

حسن افروز۔ ہاں ماما جلدی جاؤ اور بہن صفیہ کو اوپر ہی بلا لاؤ۔ دیکھو مارے خوشی کے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

ماما یہ سنتے ہی نیچے چلدی۔ اور ہمارے ناول کی ہیروین حسن افروز کو تھوڑے عرصہ کے غم غلط کرنے کی فرصت ملی۔ وہ پشہ وغیرہ درست کیا۔ انگیا کسی اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اور پاندان سے پان لگا کر لگایا اور گلوری بنا کر منہ میں رکھی اور سہیلی کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ایک نازنین تبسم کرتی ہوئی اوپر آن موجود ہوئی اور دوڑ کر

حسن افروز سے مصافحہ کیا۔ اور گلے سے ملی۔ اور دیر تک خوشی کے آنسو بہاتی رہیں
بعد میں الگ ہوئیں اور افروز نے اپنے ہاتھ سے گلوری بناکر صفیہ کو دی۔
جسکے جواب میں صفیہ نے جھک کر آداب کیا اور کہا۔

صفیہ خانم۔ کہو حسن افروز خوش تو ہیں۔

حسن افروز۔ خدا کا ہر طرح فضل ہے۔ تم سناؤ دہلی میں خوش تو رہیں۔

صفیہ خانم۔ بہن میں فضل خدا سے ہر طرح خوش تھی۔ ابا جان نے میرے لئے تمام عیش کا سامان مہیا کر رکھا تھا۔ مگر تمہاری جدائی البتہ شاق تھی۔ مگر بہن افروز تم مجھے دبلی معلوم ہوتی ہو۔ دیکھو تمہارا چاند سا چہرہ زرد ہے کہو خیر تو ہے۔

حسن افروز۔ خدا کا فضل ہر دم شامل حال ہے کچھ نہیں۔ یونہی موسم کی تبدیلی کے باعث البتہ رنگ زرد ہے۔

صفیہ خانم۔ واہ افروز بہن خوب کہی بات وہ کہیں جو بن جاتی کبھی موسم سرما کے آغاز میں بھی انسان تم سا دبلا پتلا ہو جاتا ہے۔ آگے ہمیشہ موسم سرما میں میں دیکھا کرتی تھی۔ کہ تمہارے رخسار انگارے سے سرخ ہوتے تھے۔ مگر اب عجیب حال دیکھ رہی ہوں۔ تمام چہرے پر مایوسی کے سے آثار نمایاں ہیں۔ کہو بہن کہو خدا کے واسطے صفیہ پر اپنا حال دل عیاں کرو۔

حسن افروز۔ آہ کہوں پر کس زبان سے کہوں میری پیاری سہیلی نہ پوچھو۔ نہ پوچھو۔ کہ میں کہنے سے معذور ہوں۔ میں ایسی بیہودہ کلام تم سی معزز سہیلی سے نہیں کہہ سکتی مبادا تم بھی شیریں و زبیدہ کیطرح میرے ہاتھ سے نکلجاؤ۔ آہ پھر کوئی دمساز اس بے وفا زمانہ میں نہ نظر آئے گا۔

صفیہ خانم۔ نہیں نہیں تم صفیہ کو ان بیہودہ بے وفا سہیلیوں سے نہ مشابہ کرو۔ اُنکے نطفے میں فرق ہوگا۔ کہ سہیلی کو غم کے وقت دغا دے گئیں۔ میری جان سے عزیز سہیلی تمام ماجرا بے کم و کاست کہہ ڈالو۔ اگر مجھ سے ہوسکا تو حتی الامکان میں اس کے سعی کرنے کی کوشش کرونگی۔ ہاں افروز کیا واقع ہے؟

حسن افروز۔ تمہارا اصرار کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اسلئے میں کہتی ہوں۔ اچھا تو سنو۔ آج قریباً ایک ماہ گذر چکا ہے۔ کہ میرے بھائی افتخار احمد کو دعوت دی گئی تھی تمام ان کے دوست و آشنا یہاں موجود تھے۔ تم حیران ہو گی۔ کہ آیا یہ دعوت کیسی تھی۔ کیوں دی گئی اور کس نے دی۔

اس دعوت کا بانی ہمارا ہی سنتی ہوں۔ کہ ایک نوجوان میرے بھائی افتخار احمد کا دوست تھا جسکا نام غالباً ...... (سوچنے لگی) ہاں یاد آگیا کہ عبد الستار.... ہے۔ آنکھیں نیچے کر کے گردن جھکا لی۔

صفیہ خانم۔ ہاں ہاں آگے کہو بہن۔ اپنی سہیلی سے کیوں شرماتی ہو۔

حسن افروز۔ کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔

صفیہ خانم۔ واہ شرم کیسی بڑے افسوس کی بات ہے۔ کہ اپنی محرم راز سہیلی سے شرم! بھلا مجھ سے شرمانے کی کون سی بات ہے۔

حسن افروز۔ خیر بہن میں اس جلسے کی رونق اوپر کے روشندان سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ تمام کمرہ رشک فردوس بن رہا تھا۔ اگر تعریف کروں۔ تو طول ہوتا ہے۔ خیر اتنے میں دو نوجوان کلائی میں کلائی ڈالے اندر آئے۔ ان میں سے جو داہنی طرف تھا اتنا خوبصورت تھا۔ کہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ گو میں نے ایکدفعہ آگے بھی دیکھا تھا۔ مگر اس دفعہ ایسا خوبصورت معلوم ہوا۔ کہ فوراً دل تڑپ اٹھا۔

جب دونوں نوجوان اندر آئے۔ تو تمام دوستوں نے ان کے نام پکارے۔ اور نعرۂ خوش آمدید بلند کیا۔ جن میں سے ایک کا نام شاید.... عبد الستار تھا۔ اور.... دوسرے کا نام احمد نواز تھا۔

صفیہ خانم۔ بہن کیا کہا۔ (حیرانگی ظاہر کی)

حسن افروز۔ احمد نواز۔

صفیہ خانم۔ خیر آگے بیان کرو۔

حسن افروز۔ صفیہ مگر تم اس نام سے کیوں حراساں سی ہو گئیں۔

صفیہ خانم۔ نہیں یونہی مجھے سمجھ نہیں آئی تھی۔ اسلئے دوہرایا تھا۔ اور تو کوئی بات نہیں۔

حسن افروز۔ نہیں صفیہ خانم نہیں۔ یہ تمہاری بات قابل اعتبار نہیں۔ افسوس تم بھی جھوٹ کہنے لگیں۔ اچھا کیا ہوا میں بھی آگے بیان نہ کرونگی۔

صفیہ خانم۔ میری پیاری سہیلی خفا ہونے کے بات نہیں لو سنو جنکا نام تم نے آخیر میں نام لیا تھا۔ وہ میرا منگیتر ..... نیچے گردن جھکا لی۔

حسن افروز۔ (آئیں منگیتر) کیا خوب .... واہ واہ مگر تم یقین کے ساتھ کہتی ہو۔ کہ وہی تمہارے منگیتر ہیں۔

صفیہ خانم۔ تمہارے بتانے اور بیان کرنے سے تو جو کچھ میں نے عرض کیا ہے بالکل درست عرض کیا ہے۔ کیونکہ میں نے سنا ہے۔ کہ اُن کے ایک دوست بھی ہیں۔ جن سے اُنکا بہت راہ و رسم ہے۔ اور اُنکا نام واقعی عبدالستار ہے۔

حسن افروز۔ بس بس اسی ظالم نے مجھ بدنصیب کا دل چرالیا ہے۔ آہ صفیہ اب دل چاہتا ہے۔ کہ جان دیدوں۔ بہن ہمارے معزز خاندان کو دھبہ لگنے ہی والا ہے۔ آہ آہ ....

صفیہ خانم۔ کیوں غم کھاتی ہو۔ قسم ہے خدا کی تمہاری امیدوں کو میں ضرور پورا کروں گی تم کسی قسم کا فکر و تردد نہ کرو۔ صرف ایکماہ ٹھہر جاؤ۔

حسن افروز۔ (ایک ماہ) .. نہیں نہیں ایک ماہ میرے لئے برابر ایک صدی کے ہے۔

صفیہ خانم۔ افروز۔ افروز صبر کرو۔ دیکھو تو میں تمکو ایک ماہ تک تمہارے دلبر سے ملادونگی۔

حسن افروز۔ پیاری ہمشیرہ۔ یہ دلبری کسی اور کو دو۔ میں بھلا کب ایسی چکنی چپڑی باتوں میں آتی ہوں۔

صفیہ خانم۔ تو کیا تمہیں میری بات پر یقین نہیں۔

حسن افروز۔ یقین کیوں نہیں مگر نہ ہونے والی بات پر کیسے یقین کر سکتی ہوں۔
صفیہ خانم۔ میں جو کہتی ہوں۔ کہ تمہارا یہ عقدہ حل کرنا بہت آسان ہے۔ مگر ایک ماہ سے پہلے ناممکن ہے۔
حسن افروز۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ ذرا مہربانی سے تشریح کیساتھ بیان کرو۔
صفیہ خانم۔ کیا تم میرے منہ سے کہلا کے چھوڑو گی۔
حسن افروز۔ کیوں نہیں۔
صفیہ خانم۔ اچھا سنو۔۔۔ میری ایک ماہ تک شادی ہونیوالی ہے جب شادی ہو جاویگی۔ تو تمہارا تذکرہ ان سے کرونگی۔ پھر وہ جا کر تمہارے دلدار سے کرینگے تب انشاء اللہ تعالےٰ تمام کام درست ہو جاویگا۔
حسن افروز۔ مگر بہن حکمت عملی سے کام لینا۔ ایسا نہ ہو۔ کہ بدنامی کا باعث ہو۔ آگے تم خود دانا ہو۔
صفیہ خانم۔ تم کچھ فکر نہ کرو ۔میں خوب کام بنا دونگی۔ کہ وہ خود تمہارے شیدا ہو جاوینگے
حسن افروز۔ واللہ اگر تم مجھ کو اس آزار عشق سے رہائی دلواؤگی۔ تو سچ کہتی ہوں۔ کہ تمام عمر ممنون احسان رہونگی۔
صفیہ خانم۔ بہن کیوں شرمندہ کرتی ہوں۔ سب کام انشاء اللہ راست آوینگے
حسن افروز۔ اچھا اب اس گفتگو کو بند کرو۔ کہ دل بیقرار ہوتا ہے۔
صفیہ خانم۔ جو فرماؤ کہنے کو تیار ہوں۔

اتنے میں ماما بسم اللہ سامنے سے نمودار ہوئی۔ اور کہنے لگی۔

ماما۔ جناب بیوی صاحبہ کھانا تیار ہے۔ ضرورت ہو تو حاضر کروں۔
حسن افروز۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ مگر ہاں میری پیاری سہیلی ضرور کھائیگی۔
صفیہ خانم۔ نہیں افروز مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ آگے تم نے دودھ پلا کر سیر کر دیا ہے۔
حسن افروز۔ کچھ تھوڑا بہت۔

صفیہ خانم۔ سچ کہتی ہوں۔ کہ بھوک نہیں اگر بھوک ہوتی۔ تو ضرور تھوڑا تناول کرتی آخر یہ بھی تو اپنا ہی گھر ہے۔

حسن افروز۔ ہماری ہی خاطر سہی۔ کون سے بیاں کھانے والے پکے ہیں۔ ہاں اگر زندگی نے وفا کی۔ تو ایک دن تمہاری دعوت دونگی۔ پھر انشا اللہ جو کچھ ہوگا۔ خدمت بجا لاؤنگا۔

صفیہ خانم۔ بہتر ہے۔ مگر بغیر تمہارے ہرگز نہ کھاؤنگی۔

حسن افروز۔ ہاں۔۔۔۔ تھوڑا میں بھی کھالیتی ہوں۔ (ماما سے) جاؤ ماما جلدی حاضر کرو

تھوڑی دیر بعد ماما نے نہایت عمدہ لوازمات دسترخوان پر چن دیئے۔ اور بعد میں دونوں سہیلیوں کے ہاتھ دھلوائے۔ اور ان نازنینوں نے نہایت ہی تکلف سے کھانا شروع کیا۔ کھانے سے فراغت پاکر دونوں نے گلوریاں منہ میں رکھیں۔ اور صفیہ خانم نے جانے کی استدعا کی۔

حسن افروز۔ نہیں بہن ابھی تو نہیں جانے دونگی۔

صفیہ خانم۔ نہیں اب اجازت ہی دے دو۔ کہ تیاری کروں۔ پھر شادی سے پہلے اگر موقعہ لگا۔ تو حاضر خدمت ہوں گی۔

حسن افروز۔ بہت اچھا۔ جی تو نہیں چاہتا۔ کہ جدا کروں۔ مگر تمہارے اصرار سے مجبور ہوں

صفیہ خانم۔ میں تمہاری مشکور ہوں۔

حسن افروز۔ ماما جاؤ۔ جمن کو ڈولی کے لئے بھیجو۔ صفیہ خانم جانے کے لئے تیار ہیں۔

ماما۔ بہت اچھا حضور۔ اتنا کہہ کر ماما چلدی اور صفیہ نے حسن افروز سے یوں کہا۔

صفیہ خانم۔ بہن افروز۔ شیریں وزبیدہ کا حال تو سناؤ۔ آیا کبھی وہ آتی بھی ہیں یا نہیں

حسن افروز۔ بھلا اب وہ کاہے کو یہاں آنے لگیں ہیں۔ انکو تو یہاں آتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

صفیہ۔ وہ ہیں ہی بے وفا۔ وضع کرو نہیں آتیں نہ آویں۔ ہماری بلا سے۔

خیر یہ دونوں سہیلیاں اور بھی اسی طرح کی گفتگو میں کرتی رہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد ماما بسم اللہ آئی اور کہنے لگی۔

ماما۔ حضور ڈولی دروازے پر کھڑی سرکار کا انتظار کر رہی ہے۔

حسن افروز۔ (صفیہ سے) خدا قسم اب تمہارے جانے کے بعد طبیعت اداس ہوجائیگی
کیا کروں مجبور ہوں۔

صفیہ۔ میری سہیلی میں بھی معذور ہوں۔ امی انتظار کرتی ہونگی۔ ورنہ کب دل چاہتا
ہے۔ کہ تم سی عزیز سہیلی سے جدا ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ آداب عرض ہے۔

دونوں نازنین آپس میں لپٹ گئیں۔ کہ گویا آفتاب وماہتاب گلے مل رہے
ہیں۔ بعد میں صفیہ خانم جدا ہوئی۔ دست پنجہ کیا۔ اور نیچے آخری نگاہ ڈالتی ہوئی آگئی۔
پردے کا سامان تو پہلے ہی تھا۔ جاتے ہی ڈولی میں بیٹھ گئی اور کہاروں نے یہ جا وہ جا
آناً فاناً نظروں سے غائب کر دیا۔

حسن افروز دیر تک اپنی کھڑکی سے پیاری سہیلی کو دیکھتی رہی۔ جب ڈولی نظروں
سے غائب ہوگئی تو بیچاری غم کی ماری اپنے کمرے میں گئی۔ اور فراق یار میں تلملانے
لگی

پُراسرار آدمی

اہ سمبر ہے۔ قریباً عصر کا آغاز ہے۔ ہر سو باد صرصر چل رہی ہے۔ تمام شجر و گل پروردگار
کی حمد و ثنا میں جھوم جھوم کر مشغول ہیں۔ خاصکر وہ خطہ جو بھاٹی دروازہ اور ٹکسالی کے
درمیان میں واقع ہے۔ رشک فردوس بن رہا ہے۔ گل کھلے ہوئے ہیں۔ جن کی خوشبو
نے تمام باغ کو معطر کر دیا ہے۔ اور بلبل دن کے وداع ہونے پر ادھر اُدھر پھر پھر کر
اپنی نازک چونچ سے بوسے دے رہی ہے۔ اور انکو دوسری صبح کی امید پہ ملنے کے لئے خیرباد
کہہ رہی ہے

اس وقت اس خطۂ فردوس میں تین نوجوان بیٹھے راز و نیاز کی گفتگو میں مشغول ہیں
ناظرین یہ کون صاحبان ہیں۔ آپ نے پہچانا یا نہیں۔ اگر نہیں پہچانا تو سُنئے۔ یہ ہمارے
مسٹر عبدالستار۔ افتخار احمد اور مسٹر فخرالدین صاحب ہیں۔

عبدالستار - مسٹر احمد نواز - یار دیکھو اس وقت کیا ہی بہار ہے - پھولوں کو دیکھو - ایسے معلوم ہوتے ہیں - جیسے سر اُٹھا کر کسی عاشق نامراد کیطرح معشوق کی راہ دیکھ رہے ہیں -

احمد نواز - واقعی درست کہا بھئی ذرا بلبل زار کو بھی دیکھو - پھولوں پر کس طرح نثار ہوئی جاتی ہے -

عبدالستار - بے شک - اب ذرا اسکی اور میری حالت کا مقابلہ کرو - (اُنگلی سے اشارہ کرکے) دیکھو دیکھو اس پھول کی پنکھڑی کو چونچ میں لے رہی ہے - گویا کہ پھول کی نازک پنکھڑی کو بوسہ دے رہی ہے - آہ آہ بلبل میرے سے ہزار درجہ خوش ہے - افسوس یہ تو اپنے معشوق کا بوسہ پہ بوسہ لے رہی ہے - مگر آہ میں بدنصیب بالکل محروم آہ بوسہ تو کجا میں تو صورت جاناں سے بھی نابلد ہوں -

فخرالدین بھئی ستار تمہاری حالت واقعی قابل رحم ہے - خدا تمہاری حالت زار پر رحم کرے مگر میں بھی تو سنوں - کہ تم کس پری کے دیوانے ہو اور کس شمع کے پروانے ہو -

عبدالستار - یہ پھر کسی وقت پوچھ لیجئیگا - باقی رہا میری حالت کا درست ہونا - آہ آہ اب گوشۂ قبر یاد کر رہا ہے - جہاں میری حالت تاحشر اچھی رہیگی - میں تمام حسرت و امید دل کو ساتھ دل ہی دل میں لئے چلتا ہوں - اور اپنی جوانی اُس بُت خوبرو پر نثار کیا چاہتا ہوں -

احمد نواز - خدا کے واسطے یہ غضب نہ کرنا - اپنی جوانی پر رحم کھاؤ - یہ کام کرکے تم خدا کو کیا جواب دوگے -

عبدالستار - خدا جو پوچھے گا مجھ سے کیوں جان دی جوانی میں -
دکھلا کے اُسکو کہونگا یہ اس جوان کے لیئے -

فخرالدین - ستار خدا کے لئے ناامید نہ ہو ؎
اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ مایوس ہو اُس سے امیدوار

بھائی سمیں تمہاری بہتری ہوگی۔ وہ مالک کون و مکان ہے۔ اور مالک سانس و جان ہے۔ کیا آپ بھول گئے۔ کہ رنج کے بعد راحت کا آنا لازمی امر ہے۔ اور اسی طرح راحت کے بعد رنج۔ اب تمہیں بھی چاہئے۔ کہ امید رکھو اور اُسکے فضل کی امید رکھو۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ عنقریب تمہارے دن پھیریگا۔

عبدالستار۔ مجھے تو امید نہیں۔

احمد نواز۔ بھائی فخرالدین آپ خاموش رہیں۔ میں انکو بہت سمجھا چکا ہوں۔ مگر یہ ان دنوں کچھ ایسے عشق میں متوالے ہو رہے ہیں۔ کہ نصیحت وغیرہ کچھ کام نہیں کرتی اب تو میں نے اُکتا کر خاموشی اختیار کرلی ہے۔

عبدالستار۔ ؎ ناصحا مت کر نصیحت کیا ہمیں سمجھائے ہے۔
نیک و بد سوجھے نہیں جب دل کہیں لگجائے ہے۔

بھائی فخرالدین۔ بھائی احمد نواز نے جو کچھ فرمایا ہے۔ بجا فرمایا ہے۔ اگر ان کا دل کسی بت خوبرو پر آجاوے۔ تب میں جانوں۔ کہ میری طرح دیوانے نہ بنیں۔ جناب عالی تمام باتیں تب تک ہی کرنی آتی ہیں۔ جبتک کہ دل کسی کی کالی کالی زلفوں میں نہ اُلجھہ جاوے۔ اور وہ زہریلی ناگن بن کر نہ ڈسیں۔

احمد نواز۔ خیر آپ ان باتوں کو قطع کرو۔ کیونکہ ایسی باتیں کرنے میں بہت وقت پڑا ہے۔ ذرا برائے عنایت مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ کو اُسدن جب کہ جلسہ تھا۔ کیا ہو گیا تھا۔ کہ آپ مسٹر اُفتخار احمد کے کوچہ میں بے ہوش بُت بیجان کیطرح پڑے تھے۔ میں اتنے دن اسلئے خاموش رہا۔ کہ آپ کا ستم رسیدہ دل میرے واقعہ یاد دلانے سے رنجیدہ نہ ہو۔

عبدالستار۔ کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔

احمد نواز۔ تو بھلا بیہوش بُت بیجان کیطرح فرش زمین پر کیوں پڑے ملے تھے۔

عبدالستار۔ کون میں۔ واہ صاحب کیا خواب دیکھ رہے ہو۔ ارے میاں میں کب بے ہوش ہوا تھا۔

فخرالدین - کیوں مکرتے ہو۔ کیوں مکرتے ہو۔ میں خود یہ واقعہ پوچھنے ہی والا تھا۔ کہ یہ حادثہ جانکاہ تم پر کیسے گذرا۔

عبدالستار۔ ارے میاں۔ کیوں دق کرتے ہو۔ بھلا میں اگر بیہوش ہوتا۔ تو اپنے آپ کو صبح کیونکر اپنے گھر پر پاتا۔

فخرالدین - پھر تمہیں معلوم ہی نہیں۔ سُنئے جب میں نے اسدن غزل پڑھی تھی۔ تو تم سُن کر باہر چلدیئے۔ بعد میں پھر تم نے احمدنواز صاحب کو بلایا۔ کہئے آپ نے چھنو کے ہاتھ بلا بھیجا تھا۔ یا نہیں۔

عبدالستار۔ ہاں میں کب اس بات سے منکر ہوں۔

فخرالدین - بعد اس کے قریباً آدھ گھنٹہ کے مسٹر احمدنواز آپ کے آنے سے بیقرار ہوئے۔ چنانچہ اُن کے دل میں تشویش سی پیدا ہوئی۔ اور سچ پوچھو تو ہمیں بھی تعجب ہوا۔ کہ مسٹر عبدالستار کا اتنی دیر تک باہر رہنا خالی از علت نہیں۔

خیر مسٹر احمدنواز اُکتا کر باہر گئے۔ اور بعد چند لمحوں کے تمہیں کندھوں پر اٹھا کر اندر لائے۔ آپ اسوقت بے ہوش تھے۔ آپ کو تن بدن کی ہوش نہ تھی۔ بعد میں آپ کی خاطر بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ تمام دوست حیران تھے۔ کہ آیا یہ کیا اسرار ہے۔ آخر سب دوستوں کی رائے کے مطابق آپ کو احمدنواز نے اُٹھا کر دولتخانے پر پہنچا دیا۔

اب تو ایسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ع

جو کچھ کہ دیکھا خواب تھا اور جو سُنا افسانہ تھا

اب تو تمام واقعہ گذشتہ مسٹر عبدالستار کے سامنے پھرنے لگا۔ وہ تمام واقعہ یاد آیا۔ کہ مسٹر عبدالستار کا اندر جاتے ہوئے سیاہ پوش کا روکنا اور اسکا ایک کونے میں لیجا کر دھمکانا بعد میں چھری دکھانا اور حال پوچھنا۔ پھر اس سیاہ پوش کی بجائے ایک نہایت ہی خوبصورت حسین مہ جبین کا نظر آنا۔ پھر اُسکا آنکھ جھپکتے ہی غائب ہو جانا وغیرہ وغیرہ یاد آگیا۔

احمدنواز۔ ہاں ذرا پھر ہمیں بھی وہ واقعہ سنا دیں۔

عبدالستار۔ آہ بھائی نواز نہ پوچھو نہ پوچھو۔ آہ دل جلے کے واقعات کو یونہی پوشیدہ رہنے دو۔

احمد نواز۔ آخر تمہیں اس واقعہ کے بتانے سے کیوں عار ہے۔ سمجھ نہیں آتا۔ کہ حراساں ہونے کی کون سی بات ہے۔

عبدالستار۔ خیر تو سنو (تمام واقعہ دہرا دیا)

تھوڑی دیر تک تینوں نوجوانوں میں سناٹا طاری رہا۔ آخر اس مُہر سکوت کو مسٹر احمد نواز نے توڑا۔ اور کہا۔

احمد نواز۔ شاید یہ واقعہ تم نے خواب میں تو نہیں دیکھا۔ واللہ مجھے تو بالکل اعتبار نہیں آتا۔

عبدالستار۔ اعتبار آوے یا نہ آوے۔ جو کچھ اصل واقعہ تھا۔ بیان کر دیا ہے۔ اب ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں ہے۔

فخرالدین۔ یہ واقعہ تو سوائے طلسم یا جادو کے ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے۔ بھلا اس سیاہ پوش کا ہویدا ہونا۔ جسکو تم مسٹری مین کے لقب سے پکارتے ہو۔ اور پھر ایک نازنین کا پیدا ہونا۔ جسکے حسن لاثانی کے آگے آفتاب کا شرمندہ ہونا اور گردن جھکاتے ہی غائب ہو جانا۔ اگر یہ طلسم یا خواب نہیں تو اور کیا ہے۔ طبیعت تو واللہ اسی بات پر ٹھہرتی ہے۔ کہ آپ نے خواب دیکھا ہے۔

عبدالستار۔ خدا کی قسم جھوٹ نہیں کہتا۔ مسلمان ہو تو یقین کے ساتھ جانو۔ کہ جو کچھ عرض کیا ہے۔ صریحاً سچ ہے۔ بھلا اگر میں اس نازنین زہرہ جبین پری پیکر رشک قمر کو نہ دیکھتا۔ تو آپ کو بے ہوش پڑا کیسے ملتا۔

احمد نواز۔ یہی تو بات ہے کہ جو مجھے سچ ماننے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ مگر ہاں کوئی پتہ و نشان بھی دیا تھا۔ یا نہیں۔

عبدالستار۔ اگرچہ اس نے پتہ دیا ہوتا۔ تو تمام عقدہ حل ہو جاتا۔

احمد نواز۔ تو کیا تم کو اُس سے محبت ہے۔

عبدالستار۔ کیوں نہیں ضرور ہے۔
احمدنواز۔ بس بس اب معلوم ہو گیا۔ کہ تمہارا عشق خام ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ ہائے وائے اب فضول ہے۔
عبدالستار۔ تمہیں معلوم ہے کہ کیوں اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وجہ یہ ہے۔ کہ مجھے اس سے بوئے یار آتی تھی۔
احمدنواز۔ خیر کچھ بھی ہو بہتر ہے۔ کہ اب آپ اس شعر کا ہردم ورد کیا کریں۔ ؎

ناچار ہوں اس دل صورت پسند سے
دیکھا کوئی حسین تو فوراً مچل گیا

عبدالستار۔ نواز ایسا مت کہو۔ خدا کے لئے ایسا مت کہو کہ جگر میں ٹھیس سی لگتی ہے۔ واللہ اس سے بوئے یار آتی تھی۔
احمدنواز۔ آگے تو خیر دیوانے نہ تھے۔ مگر اب ضرور ہو۔ ارے دیوانے دوست۔ کیا وہ ایک بڑے گھرانے کی لڑکی اور پردہ دار خاتون ہو کر کھلی ایسی بے حیائی سے ملنا گوارا کریگی۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں
فخرالدین۔ یہ بات تو نہ کہو۔ کیونکہ عشق خانہ خراب۔ دشمن انسان ہے۔ اس کے مذہب میں۔ ذات۔ مذہب۔ اعتقاد۔ اصول۔ پردہ وغیرہ سب کے سب ناجایز ہیں۔ جبتک ذات والے کو بے ذات۔ مذہب والے کو بے مذہب اسی طرح سے بے اعتقاد۔ بے اصول اور بے پردہ نہ کرے۔ چین نہیں پاتا۔ البتہ یہ بات قابل سماعت ہے کہ شرفا کی خاتونیں ایسا بڑا کام نہیں کر سکتیں۔ یہ کام ان ہی سے سرزد ہونگے۔ جو کہ تہذیب و تمدن سے بے بہرہ ہوں۔ آگے یہ حضرت عشق ہے۔ خواہ کوئی بڑے ہی گھرانے کی کیوں نہ ہو۔
احمدنواز۔ مگر یہ تو میں ضرور کہوں گا۔ کہ وہ (یعنی اسکی معشوقہ) نہ تھی۔
عبدالستار۔ خیر نہ ہو گی۔
فخرالدین۔ بھائی احمد نواز۔ واللہ دیکھو۔ اس وقت کیسی بہار ہے۔ میرا خیال

ہے کہ دریا پر چلیں۔ سائیکلیں یہاں موجود ہیں۔ دم بھر وہاں سے بھی تفریح طبع کر آویں۔ جب مغرب کا وقت قریب ہوگا۔ لوٹ آوینگے۔

احمد نواز۔ یہ بات تو نہایت ہی مناسب کہی۔ یہاں سے نزدیک بھی ہے۔ (ستار سے) کیا تم تیار ہو۔

عبد الستار۔ (شکستہ دلی سے) ہاں مگر دوست میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہاں جانا باعث رنج ہے۔

احمد نواز۔ لو مسٹر فخرالدین اور سنو اب تو عورتوں کیطرح بد شگونیوں پر جناب نے عمل درآمد کرنا شروع کر دیا ہے۔ خدا خیر کرے۔

عبد الستار۔ آہ نواز ایک دل جلے کو جلانا ٹھیک نہیں۔ آہ جلا کر اس پر تیل چھڑکنا ناروا ہے۔ اور تم جیسے دوست جنکا کہ ایک قالب دو جان ہے۔ پھر تم سی ایسی باتوں سے جو جلائے کتنا بڑا افسوس ہے۔ خدا کے لئے مجھ پروانے کو مت ستاؤ۔ کہ میں عنقریب اس شمع رو پر فدا ہونے والا ہوں۔

احمد نواز۔ واہ عبد الستار کیا ہنسی کی باتوں سے ناراض ہو گئے۔ اچھا اگر تم کو میری یہ باتیں نہیں بھاتیں۔ تو واللہ کبھی بھی زبان پر نہ لاؤنگا۔ لو تو اٹھو دریا پر چلو۔

اتنا کہکر پہلے احمد نواز۔ پھر فخرالدین اور بعد میں عبد الستار اٹھا۔ اور سائیکلیں لیکر سیدھے دریا کو روانہ ہوئے۔

جب وہاں پہنچے۔ تو دریا کے چڑھاؤ کیطرف روانہ ہوئے۔ جاتے جاتے جب ریلوے پل اور جرنیلی پل کے درمیان پہنچے۔ تو ان جھاڑیوں سے ایک برقعپوش نمودار ہوا۔ اور ڈپٹ کر ان تینوں نوجوانوں کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ڈانٹ کر کہنے لگا۔

برقعہ پوش۔ خبردار اگر ذرا بھی آگے قدم بڑھایا۔ تو یاد رکھنا۔ کہ ڈنڈا تم تینوں کا سر پھوڑ دیگا۔

ان نوجوانوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اگر ہوشیار اور ذی حوصلہ تھا۔ تو مسٹر نواز احمد تھا۔ جو جھٹ آگے بڑھا اور پکارا۔

احمد نواز ۔ تو کون ہے ۔ جو ہمیں ڈراتا ہے ۔ حرامزادے کہیں کے بیوقوف ۔

برقعہ پوش ۔ ڈنڈے سے ڈرا کر ۔ زبان سنبھالو ۔ ورنہ ابھی اس ڈنڈے سے سر پھوڑ دونگا ۔

اب تو مسٹر احمد نواز کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ آگے بڑھکر ایک گھونسہ اس نقاب پوش کے منہ پر رسید کیا ۔ کہ وہ دور بدحواس ہوکر گر پڑا ۔

نقاب پوش نے گرتے ہی پکارا ۔ ارے یارو پکڑلو ۔ کیا دیکھتے ہو بس مار ڈالو ۔

یہ الفاظ سنتے ہی ویسے ہی نقاب پوش ہٹے کٹے آموجود ہوئے ۔ اور فخر الدین اور ستار سے جمپٹ گئے ۔ اب ناظرین والا تمکین لگیں چلنے ادہر وہ مسٹری مین ان کا قدیمی دشمن اٹھا اور چھری لیکر احمد نواز کی طرف جھپٹا ۔

احمد نواز نے نہایت ہی پھرتی سے اسکا وار خالی گیا ۔ اور پینترا بدل کر اسکا چھری والا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اور اس زور سے دبایا کہ آخر اس پراسرار آدمی کو چھری چھوڑ دینی پڑی ۔

جب احمد نواز نے دیکھا کہ چھری اس کے ہاتھ سے گر پڑی تو جھٹ کمر میں ہاتھ ڈالکر اٹھایا ۔ اور سر سے بلند کر کے زمین پر دے مارا ۔ اور خود اپنے پیارے دوست عبدالستار کی طرف گیا ۔ جو کہ نہایت ہی ردی حالت میں تھا ۔ جاتے ہی اسکو یعنی عبدالستار کو پنجۂ ظالم سے رہائی دلوائی ۔ اور مارے گھونسے کے دشمن کی خبر لینے لگا ۔ آخر اسکو بدحواس کر ہی دیا ۔

ادہر جب اس پراسرار آدمی یعنی ان کے قدیمی دشمن نے دیکھا ۔ کہ عنقریب اسکا ساتھی ہلاک ہوا چاہتا ہے ۔ تو خود بھی احمد نواز کی طرف جھپٹا ۔ اب ہمارا احمد نواز دوست دو دشمنوں کے پنجے میں ہے ۔

مگر شاباش کہ احمد نواز پر کہ بجائے اسکے کہ وہ بدحواس ہوتا زیادہ ہوشیاری سے دونوں سے نپٹنے لگا ۔

ادہر ہمارے فخر الدین صاحب بھی ایک قوی ہیکل کے ساتھ نپٹ رہے ہیں ایک کھاتے ہیں ۔ تو گویا دو لگا دیتے ہیں گویا کہ ان دونوں کی لڑائی برابر کی ہے ۔

خیر مسٹر احمد نواز نے نہایت ہی چستی پھرتی دکھائی شروع کی ۔ یعنی کہ ایک کی خبر ہاتھوں سے اور دوسرے کی خبر پاؤں سے ۔ تھوڑی دیر تک لڑائی کا بازار اسطرح

گرم رہا۔ تمام کپڑے مسٹر احمد نواز کے پھٹ گئے۔ اور جابجا اسکا سفید سفید بدن دکھائی دینے لگا۔

لڑائی کو طول ہوتا دیکھکر مسٹر احمد نواز نے خیال کیا۔ کہ اگر اس طرح میں تمام رات لڑا کرونگا۔ تو بھی سر بر آور نہ ہو سکوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ترکیب سوچی اور اسی وقت چند قدم پیچھے ہٹے۔ ادھر اُن دونوں حریفوں نے یکبارگی حملہ کیا۔ تو مسٹر احمد نواز نہایت ہی چالاکی سے بیٹھ گئے۔ اور انمیں سے ایک کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل کر پیچھے جا کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں تیزی میں تو تھے ہی دھڑے سے منہ کے بل زمین پر جا کر گرے۔

اس موقع کو احمد نواز نے غنیمت جانا۔ اور جھٹ اپنے قدیم دشمن کی گردن پکڑ کر اٹھایا۔ اور دوسرے کی گردن پر پاؤں رکھ کے دبانا شروع کیا۔ دونوں نے ہر چند کوشش کی۔ کہ مسٹر احمد نواز کے فولادی پنجے سے رہائی پاویں۔ مگر سب بے سود ثابت ہوئی۔

مسٹر عبد الستار نے مسٹر احمد نواز کیطرف سے اطمینان حاصل کر کے مسٹر فخر الدین کی طرف قدم بڑھایا۔ کہ اُنکی مدد کریں۔ ابھی یہ وہاں تک پہنچے بھی نہ تھے کہ اُن کے سر پر ایک پتھر پڑا اور لفظ ہائے نکلا اور وہ بیہوش ہو گئے۔

ناظرین آپ حیران ہونگے۔ کہ یہ پتھر کس نے مارا۔ سنئے اُن کے قدیمی دشمن کو مسٹر احمد نواز نے گردن پکڑ کر جب اٹھایا تھا۔ تو اس نے اُٹھتے ہوئے ایک پتھر کو پکڑ لیا۔ کہ مسٹر احمد نواز کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ اب اُس نے موقع پا کر مارا۔ کہ مسٹر احمد نواز نیچے کو جھک گئے۔ اور وہ پتھر ہمارے ستم رسیدہ عاشق مسٹر عبد الستار کے سر پر پڑا۔

اب تو مسٹر احمد نواز سے نہ سنبھلا گیا۔ اپنی پوری طاقت سے ایک گھونسا مسٹر یمین کے رسید کیا۔ کہ وہ اس گھونسے کی تاب نہ لا کر دھڑم سے دریا میں جا پڑا پھر احمد نواز نے اپنے پاؤں کے نیچے سے اس دوسرے آدمی کو نکالا۔ اور اٹھا کر

سر سے بلند کیا۔ دریا میں دے مارا۔ اُدہر سے فراغت پا کر مسٹر فخر الدین کی مدد کے لئے پہنچے۔ انہوں نے آگے ہی اس شخص کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اب مسٹر احمد نواز کو آتا دیکھکر اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ چنانچہ گڑگڑا کر مسٹر احمد نواز سے معافی مانگنے لگا۔ اور کہنے لگا۔ خدا کے واسطے اب مجھے چھوڑ دو۔ پھر کبھی آپ کے سامنے نہ آؤنگا۔ للہ میری حالت زار پر رحم کو کام فرماؤ۔ میں اس حرامی مسٹر میں کے دھوکے میں آگیا۔ ورنہ کبھی آپ جیسے تونگمند دلاور کے سامنے آنے کا نام نہ لیتا۔ معاف کرو۔ معاف کرو۔ میرا کچھہ قصور نہیں۔ یہ سب فتور ان ہی دو شخصوں کا اٹھایا ہوا ہے۔

احمد نواز۔ کیا تم بتا سکتے ہو۔ کہ یہ کون آدمی ہیں۔

نقاب پوش۔ ہاں بتا سکتا ہوں۔ مگر پہلے اُن سے میری خلاصی تو کرا دیجئے گا۔

احمد نواز۔ (فخر الدین سے) اچھا بھائی ذرا ان کو چھوڑ دیجئے گا۔ (نقاب پوش سے) ہاں اب کہو۔

نقاب پوش۔ ان دونوں میں سے جسکو آپنے پیچھے دریا میں پھینکا ہے۔ یا جس نے مسٹر عبد الستار سے لڑائی کی۔ وہ حسن . . . . وہ ابھی اتنا لفظ کہنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ مسٹر عبد الستار بھی ہوش میں آئے۔ اور چلا دئے۔ ہائے نواز کیا میں نہ کہتا تھا۔ کہ دریا پر جانا موجب رنج ہے۔ آہ تم نے میری ایک نہ سُنی۔ مسٹر احمد نواز اور فخر الدین دونوں اُن کی باتوں میں لگ گئے۔ اودہر وہ نقاب پوش چپکے سے یہ جا وہ جا سر کنڈوں میں غائب ہو گیا۔ جب احمد نواز اور مسٹر فخر الدین نے مڑ کر دیکھا۔ تو اس شخص کو نہ دیکھا۔ مسٹر فخر الدین نے ہر چند نظروں سے تلاش کیا مگر اسکا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر بھاگ کر سر کنڈوں میں گھسے۔ بہت تلاش کیا۔ مگر اسکا کہیں پتہ نہ لگا۔ آخر نہایت ہی پریشان صورت بنائے ہوئے سر کنڈوں سے باہر نکلنے لگے۔ کہ کسی نے ہاتھ بڑھا کر ایک ڈنڈا اُن کے سر پہ مارا۔ کہ یہ سر کنڈوں میں آہ کہکر بے ہوش ہو گئے۔

مسٹر احمد نواز مسٹر فخر الدین کا آواز سن کر ادہر ہی لپکے - سر کنڈوں میں جا کر دیکھا تو اپنے محسن کو بیہوش پایا - وقت کو ضائع نہ ہونے دیا - اٹھا کر باہر لائے تو دیکھا - کہ دریا کے پار ان کا قدیمی دشمن اور اسکا رفیق دونوں کھڑے ہیں - اور مسٹر احمد نواز کو برا بھلا کہہ رہے ہیں - انہوں نے ادہر دہیان بھی نہ کیا - اور اپنے محسن کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے - اب شام ہو چکی ہے - تمام طیور اڑ اڑ کر اپنے گھونسلے تلاش کر رہے ہیں - مسٹر احمد نواز اور مسٹر عبد الستار نے وہیں دریا سے وضو کیا - اور نماز مغرب ادا کی - اتنے میں مسٹر فخر الدین بھی ہوش میں آئے تو ان دونوں یعنی عبد الستار و احمد نواز کی جان میں جان آئی اور احمد نواز نے پوچھا -

احمد نواز - کہئے آپ پر کیا حادثہ گذرا تھا -

فخر الدین - میں اس حرامی کو دیکھکر واپس آہی رہا تھا - کہ کسی نے میرے سر پر ڈنڈا مارا - کہ میں تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑا - بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا -

احمد نواز - وہی حرامزادہ ہو گا -

فخر الدین - ہاں تو اور کون ہو سکتا ہے -

عبد الستار - چلو صاحب اب چلیں - اب باتوں میں وقت نہ صرف کریں -

اتنا سنتے ہی تینوں دوستوں نے سائیکلیں اٹھائیں - اور سڑک پر آ گئے - اور سائیکلوں پہ سوار ہو کر روانہ ہوا -

---

ایفائے وعدہ

رات کے آٹھ بجے کا وقت ہے - لاہور کے ہر ایک بازار میں بجلی جگمگا رہی ہے - لوگ جوق جوق چہل پہل رہے ہیں - موچی دروازہ کے حلوائیوں کی دکانیں نور دوں پر ہیں - ان دکانوں میں سے ایک دکان پر ایک جنٹلمین کھڑا ہوا کچھ مٹھائی خرید کر رہا ہے - یہ نوجوان وضع سے تو ہمارا آشنا معلوم ہوتا ہے - اس وقت ہماری طرف

اس کی پیٹھ ہے۔ ورنہ ابھی پہچان لیتے۔
وہ دیکھئے پھرا۔ اخاہ یہ تو ہمارے سیکنڈ ہیرو مسٹر احمد نواز صاحب ہیں۔ واہ واہ خوب قیمتی لباس زیب تن ہے۔ سر پر بنارسی صافہ ہے۔ آخر یہ کس لئے اسقدر مٹھائی وغیرہ خرید کر رہے ہیں۔ ہاں یاد آ گیا۔ کہ جناب کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ خاص اپنی بیوی کے لئے مٹھائی خریدی جا رہی ہے۔ وہ دیکھئے مٹھائی کی ٹوکری نوکر کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اور خود آگے آگے روانہ ہو گئے ہیں۔ چلئے ناظرین ہم بھی اُن کے پیچھے روانہ ہو جاویں۔ کہ ہم کو آج کا حال معلوم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

جب مسٹر احمد نواز صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ تو اپنی بیوی صفیہ خانم (جس سے ناظرین بخوبی واقف ہیں۔) انظر پڑی جسکو دیکھکر جناب نے مسکرا دیا کہ جنکو دیکھکر اس کے چہرے پر بھی تبسم نمایاں ہوا۔

احمد نواز ۔ (نوکر سے) شبراتن جاؤ۔ ممن سے نیچے جا کر مٹھائی لے آؤ۔ اور اُمّی جان کے حوالے کر دو۔

شبراتن ۔ بہت بہتر حجور (حضور)

احمد نواز ۔ اُمی جان ہیں کہاں؟

شبراتن ۔ سرکار اوپر ہیں۔ حکم ہو تو بلا لاؤں۔

احمد نواز ۔ نہیں کوئی اشد ضرورت نہیں۔ اتنا کہتے ہی نواز ساتھ کے کمرے میں گھس گئے۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنی میز کی طرف بڑھے اور کچھ کاغذات دراز سے نکالے۔ اور ان کا مطالعہ کرنے لگے۔

کاغذوں کو اُتھل پتھل کرتے کرتے ایک خط پر نظر پڑی۔ تو چونک اُٹھے۔ اور بے ساختہ یہ الفاظ منہ سے نکلے۔ اف او سخت ہی غلطی ہوئی۔ افسوس بھول ہی گیا۔ کھولا تو اس مضمون کا خط نکلا۔ . . . .

- - - - - - - - - - -

جناب بھائی صاحب احمد نواز - اداب عرض گذارش ہے - کہ جب سے آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی ہے تب سے آپنے مجھکو کم نصیب کشتۂ فراق کو بھلادیا ہے - افسوس مجھے آپ پر یہ امید نہ تھی - کہ اس طرح مجھے دغا دینگے - افسوس دنیا میں سوائے خدا کے کوئی کسی کا نہیں -

آہ آپ کے وہ وعدے کیا ہوئے - وہ محبت کہاں گئی - افسوس سب جھوٹ ثابت ہوئے - بھائی کیا آپ کی بیوی صاحبہ آپکو مجھ حقیر سراپا تقصیر سے ملنے نہیں دیتیں ؟ آہ اگر ایسا ہی واقع ظہور پذیر ہو چکا ہے تو ہاتھ باندھکر عرض پرداز ہوں - کہ صاف طور پر مجھے تحریر کریں - کہ میں صبر کی سل اپنے بریان سینہ پر رکھ لوں - آہ آہ ایک جاناں کا غم دوسرا ایک سچے رفیق کی جدائی مجھے زندہ درگور کر رہی ہے -

خدا کے لئے اگر آپ کے دل میں ویسے ہی الفت کا مادہ ہنوز باقی ہے - تو جس وقت اس محروم وصال کا نامہ ملے - تو میرے غریب خانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشیں -

میرے پیارے نواز تمہیں کیا ہو گیا - کہ یکدم ملنا ترک کر دیا - پیارے دوست آپ کے لئے تو شادی باعث راحت ہوئی - مگر آہ میرے لئے باعث رنج ہوئی ہیں آپ کو اپنا سینہ چیر کر کس طرح دکھاؤں - کہ آپ جیسے دمساز کے نہ ملنے سے کس حالت میں ہے - ایک تو تپ ہجر سے جلکر خاکستر ہوا جاتا ہے - دوسرا آپ کی بیوفائی کے سبب گھل رہا ہے - کہ اب بھی آپ تشریف نہ لائے - تو یاد رکھئے - کہ اپنے ستار کو ہرگز ہرگز زندہ نہ پاؤ گے -

طالب دیدار

عبدالستار

جب یہ رقعہ مسٹر احمد نواز نے پڑھا - تو سخت گھبرایا - کہ غضب سخت ہی کوتاہی

عمل میں آئی۔ افسوس پندرہ یا سولہ یوم گذر چکے ہیں۔ میں عبدالستار سے نہیں ملا۔ البتہ وہ میرے گھر پر بھی کئی دفعہ آیا۔ مگر میرے موجود نہ ہونے سے واپس لوٹ جاتا رہا۔ اب تو ضرور اس گشتہ ہجران کی خبر لینی چاہئے۔

اتنا کہتے ہی لپک کر دروازے کیطرف بڑھے۔ باہر نکلنے ہی کو تھے۔ کہ سامنے سے اُنکی بیوی صفیہ خانم مُسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ تو احمد نواز نے یوں کہا۔

احمد نواز۔ میری پیاری بیوی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے مسٹر عبدالستار کے ہاں چلا ہوں۔

صفیہ خانم۔ اس وقت ایسی کونسی اشد ضرورت ہے کہ آپ ایسے بے سروسامانی کے ساتھ جارہے ہیں۔

احمد نواز۔ چونکہ انہوں نے مدت سے یہ خط (دکھا کر) مجھے بھیجا ہوا ہے۔ اور بوجہ عدیم الفرصت ہونے کے نہ پڑھ سکا۔ اب یہ میری نظر سے گذرا ہے۔ اور اسکو ملنے کے لئے جارہا ہوں۔ سچ پوچھو تو اب میں بہت بیقرار ہورہا ہوں۔

صفیہ خانم۔ آخر اسمیں کیا لکھا۔

احمد نواز۔ اس میں انہوں نے میرے ملنے کا بہت اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ تو تم خود اسکو پڑھ سکتی ہو۔ کوئی پرائیویٹ نہیں ہے۔

صفیہ خانم نے اُسے لے لیا اور پڑھنا شروع کیا جب تمام خط پڑھ چکی تو حیران ہوگئی۔ اور اسوقت حسن افروز بھی یاد آگئی۔ کہ افسوس کہ وہ اسی ظالم کی تیرنگاہ کی گھائل ہے۔ جسکا یہ خط ہے۔ مگر یہ کس پر عاشق ہے۔ آہ آہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری پیاری سہیلی نامرادی رہے گی۔ کہ تمام حسرتوں امیدوں کو سینہ میں دبائے ہوئے دنیا کو خیرباد کہے گی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ ان سے بھی تھوڑا بہت حال معلوم کرنا چاہئے۔

صفیہ خانم۔ کیوں جی یہ آپ کے دوست کس پری کے دیوانے ہیں۔

احمد نواز۔ میری پیاری بیوی۔ یہ اس پر عاشق ہیں جسکی کہ مورت تک نہیں دیکھی۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ غائبانہ عاشق ہیں۔ تو بیجا نہیں۔

صفیہ خانم۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھی۔ بھلا کس پر اور کس طرح۔

احمد نواز - جان من بہتر ہے - کہ تم یہ حال میرے سے نہ پوچھو - کیونکہ مجھے اس گذشتہ ہجران کی حالت پر رونا آتا ہے -

صفیہ خانم - نہیں جناب آپ کو ضرور بتانا پڑیگا - خدا کے لئے توقف نہ کیجئے میں تو حالتہ ضرور ہی سن کر رہونگی -

احمد نواز - مجھے تمہارا اصرار کہنے پر مجبور کرتا ہے - بہتر تو یہی تھا - کہ تم یہ حال مجھ سے نہ پوچھتیں - خیر اگر تم ضرور سننا ہی چاہتی ہو تو سنو - مگر قبل اس کے کہ میں قصہ شروع کروں - تم میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤ - چنانچہ صفیہ خانم نہائیت ہی ناز و انداز سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی - اور دائیں ہاتھ کی کہنی میز پر ٹیک کر ہاتھ کی ہتھیلی ٹھوڑی کے نیچے رکھی - اور ہمہ تن گوش ہوئی - تو احمد نواز صاحب نے یوں سلسلہ گفتگو شروع کیا -

آج سے چند ماہ پیشتر ہمارے عبد الستار صاحب کے ایک عزیز دوست کسی شہر سے تشریف لائے (میں اس شہر کا نام لینا پسند نہیں کرتا)

صفیہ خانم - وہ کس لئے -

احمد نواز - جان من اس سے تمہارا کوئی مطلب نہیں - تمہیں تو قصے سے غرض ہے - خیر لو سنو - اُن کے استقبال کے لئے میرے دوست عبد الستار سٹیشن پر گئے - جسوقت وہ صاحب تشریف لائے تو وہ نہائیت ہی تپاک سے ملے - اور باتوں ہی باتوں میں وہ صاحب میرے دوست کو زنانہ کمپارٹمنٹ میں لے گئے - خیر تھوڑی دیر بعد ایک نازنین مہ جبین رشک قمر سیاہ برقعہ اوڑھے ہوئے نکلی - میری جان صفیہ خانم یہی عورت میرے معزز دوست عبد الستار صاحب کے رنج کی موجب ہوئی -

صفیہ خانم - جناب آخر وہ تھی کون - کیا کسی اور کے ساتھ تھی ؟

احمد نواز - نہیں نہیں یہ نازنین اسی دوست کے ساتھ تھی -

صفیہ خانم - تو شاید وہ اس شخص کی بیوی ہوگی - اسپر پھر انکا عاشق ہونا ہی فضول ہے -

احمد نواز۔ نہیں صفیہ نہیں یہ اسی نوجوان کی ہمشیرہ تھی۔

صفیہ خانم۔ میرے پیارے شوہر مجھے سمجھ نہیں آتا۔ کہ وہ اس برقعہ پوش پر کیسے فدا ہو گئے ممکن ہے کہ وہ برقعہ پوش بجائے ایک پری کے چڑیل ہو۔

احمد نواز۔ تمہارا خیال ایک حد تک درست ہے۔ مگر صفیہ وہ نازنین بیشک حسین تھی۔ حسین کیا۔ حسین تھی۔ یعنی کہ جس وقت وہ باہر کھڑی تھی۔ اس کے برقعے سے ایک انگلی سفید سفید برآمد تھی۔ جس پر کہ مہندی لگی تھی۔ یہ نشان ہی اس کے حسین ماننے کے لئے کافی تھا۔ دوسرا اسکا بھائی بھی نہایت خوبصورت ہے۔ جیسے وہ خوبصورت ہے۔ ویسے اسکا بھی حسین ہونا لازمی امر ہے۔

صفیہ خانم۔ بیشک ایسا ہوگا۔ مگر کیا اب تک ملاقات بھی ہوئی ہے یا نہیں۔

احمد نواز۔ پیاری میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا۔ کہ وہ اس پر عاشق ہے جسکی کہ صورت تک نہیں دیکھی۔ پیاری ملاقات وغیرہ تو کجا وہ بیچارا آفت کا مارا نام سے بھی ناآشنا ہے۔

صفیہ خانم۔ یہ تو میں ایک عجیب بات سن رہی ہوں۔ میرے پیارے شوہر تو پھر انکا عاشق ہونا ہی فضول ہے میرے ناقص خیال کے مطابق تو وہ اپنے اوپر ناحق ستم ڈھا رہے ہیں۔

احمد نواز۔ شاید تم نام محبت سے ناآشنا ہو۔ محبت وہ بلا ہے۔ کہ انسان کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ دور نہ جاؤ۔ اپنے والد ہی کو دیکھو۔ کہ کس طرح عابد و زاہد بنے بیٹھے ہیں۔ ہر وقت خدا سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔ پیاری تو کیا انہوں نے خدا کو دیکھا ہے۔ کہ ہر دم اس مالک پاک پروردگار کے نام پر تصدق ہونے کو تیار ہیں۔ بس یہی حال تم میرے دوست عالی وقار کا سمجھو۔

صفیہ خانم۔ خیر آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ کہ آپ نے مجھ حقیر کے سامنے تمام قصہ دوہرا دیا مگر ایک بات کا مجھے آپ پر افسوس ہے۔

احمد نواز۔ پیاری افسوس کیا۔

صفیہ خانم۔ وہ یہ کہ تمام واقعہ تو اپنی مہربانی سے آپ نے دوہرایا۔ مگر نام میرے سامنے پیش کرنے سے کیوں عار ہے۔ کیا میں یہ واقعہ کسی کے آگے بیان کرنے لگی ہوں۔ ہاں اگر شک ہے تو نہ فرماویں۔

احمد نواز۔ شک وشبہ بالکل نہیں مصلحتاً نہیں بتائے گئے۔ بھلا بتانے میں فائدہ ہی کیا پڑا ہے۔
صفیہ خانم۔ میرے پیارے شوہر میں عاجزانہ التماس کرتی ہوں۔ کہ آپ ان کے ناموں سے آگاہ کیجئے گا۔ شاید میں جانتی ہوں۔
احمد نواز۔ بفرض محال اگر تم جانتی بھی ہو گی۔ تو تم کیا کر سکتی ہو۔ تم کون کام انجام دے سکتی ہو۔
صفیہ خانم۔ شاید یہ کام میرے ہی ذریعہ سے انجام کو پہنچے۔ خدا کے لئے بتائیے بتائیے کہ ثواب عظیم ہوگا۔
احمد نواز۔ صفیہ صفیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔
صفیہ خانم۔ بس مدت سے جس کی دل میں ہوس ہے۔
احمد نواز۔ ہوس؟ اوصفیہ ہوس کیسی۔
صفیہ خانم۔ یہی۔ کہ ایک اہم معاملہ کی تہ تک پہنچنا ہے۔
احمد نواز۔ وہ ایسا کونسا معاملہ ہے۔ جس کے لئے تم اسقدر بیقراری ظاہر کر رہی ہو۔ تو بھلا میں بھی تو سنوں۔
صفیہ خانم۔ آپ کے بتلانے پر سب حال کھل جائیگا۔
احمد نواز۔ بہتر اگر تم پوچھنے ہی پر راضی ہو۔ تو سنو۔ اس نازنین کے والد بزرگوار کا نام سید حاتم علی اور بھائی کا افتخار احمد ہے۔
صفیہ خانم۔ خدا کے واسطے سچ کہئے کہ اس کے برادر اور والد کا یہی نام ہے۔
احمد نواز۔ ہاں پیاری بالکل سچ مگر تمہارا چہرہ کیوں عجیب وغریب رنگ بدل رہا ہے۔
صفیہ خانم۔ (بے اختیار ہو کر) آہ میری پیاری سہیلی جان سے عزیز سہیلی کو تباہ کرنے والا یہی عبدالستار ہے۔ مگر شکر ہے کہ وہ بھی اسی پری کا دلوا نہ ہے۔ آہ اگر وہ کسی اور کی زلف مشکیں کا اسیر ہوتا تو سخت قیامت تھی۔

میری پیاری سہیلی حسن افروز امید رکھ کہ کوئی دن میں تیری مراد بر آویگی جسکو کہ مدت سے پہلو میں دبائے پھرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تیری قسمت بہت ہی یاور ہے۔
احمد نواز۔ (ہراسان ہوکر) پیاری صفیہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ بھلا وہ کونسی تمہاری سہیلی ہے۔ میں بھی تو سنوں۔ خدا کے واسطے جلدی کہو۔
صفیہ خانم۔ پیارے شوہر بہت جلد جاؤ۔ اور عبدالستار صاحب کو خوش خبری دو۔ کہ جس کی زلفوں میں تم اسیر ہو۔ وہ خود تمہاری تیر مژگان کی گھائل ہے۔
احمد نواز۔ صفیہ۔ صفیہ۔ یہ تم واللہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو؟
صفیہ خانم۔ ہوش میں بالکل ہوش میں۔ میرے پیارے شوہر مدت سے میں اپنی سہیلی حسن افروز کے کام۔۔۔۔۔۔۔
احمد نواز۔ (بات کاٹ کر) یہ کس کا نام لیا ہے۔ واللہ کیا پیارا نام ہے حسن افروز۔۔
صفیہ خانم۔ یہ اسی کا نام ہے۔ جسکو کہ عبدالستار جان و دل سے نادیدہ پیار کرتے ہیں۔ خیر میں اس کے کام میں مستعد تھی۔ تو شکر ہے۔ کہ آپ نے تمام و کمال حالات مجھ پر منکشف کر دیئے۔ پیارے یہ وہی حسن افروز ہے۔ جسکو آپکے دوست نے اسٹیشن پر سیاہ برقعہ اوڑھے دیکھا تھا۔ یہ وہی حسن افروز ہے۔ کہ جسکی انگشت حنائی دیکھی تھی۔ یہ وہی پری ہے۔ جس کے مسٹر عبدالستار دیوانے ہیں۔
احمد نواز۔ آئیں صفیہ کیا تم نے جو کچھ میرے روبرو بیان کیا ہے۔ کیا واقعی سچ کیا ہے؟
صفیہ خانم۔ جناب عالی سچ۔ بالکل سچ۔ لونڈی کی کیا مجال کہ آپ کے روبرو جھوٹ کو کام میں لاوے۔

احمد نواز۔ تو میری جان ذرا تشریح سے بیان کرو۔
صفیہ خانم۔ میں دہلی سے آئی تھی۔ تو میں اپنی سہیلی کو ملنے گئی تھی۔ جسکا نام میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے مذکور کیا ہے۔ خیر جب میں نے اس بیچاری غم کی ماری کو دیکھا۔ تو وہ چاند سا چہرہ زرد معلوم ہوا۔ میں نے پوچھا۔ تو مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر پھر میرے

بے حد اصرار سے آپ کا اور عبدالستار کا جلسے میں آنا بیان کیا۔ بعدہٗ کہا کہ جو نوجوان کہ سرخ ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کی میں چاہنے والی ہوں۔ تب میں نے نام پوچھا تو کہا۔ کہ لوگ انہیں عبدالستار کے نام سے پکارتے تھے۔

احمد نواز۔ واہ پیاری واہ یہ تو خوب مژدۂ جانفزا سنایا۔ اور جوش مسرت سے اپنی بیوی کو گلے سے لگایا۔ اور اسکی پیشانی کو آہستہ سے بوسہ دیا۔ اور کہا۔ تو پیاری میں ابھی اس بدنصیب عاشق کشتۂ ہجران کو یہ مژدۂ جانفزا سنانے جاتا ہوں۔

صفیہ خانم۔ ہاں ہاں جائیں شوق سے جائیں۔ مگر مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کہ میں بھی اپنی پیاری سہیلی کو یہ روح افزا خبر سناؤں۔

احمد نواز۔ بہتر تم صبح تڑکے ہی ڈولی منگوا کر چلی جانا۔ میں ابھی جاتی دفعہ امی سے بھی کہتا جاؤنگا۔ وہ صبح ڈولی منگوا کر ممن کے ساتھ تمہیں بھیج دیں گی۔ لو میں جاتا ہوں۔ تم آرام کرو۔

اتنا کہکر مسٹر احمد نواز جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلتے بنے۔ پہلے اپنی امی کے پاس جا کر صفیہ کے بارے میں کہا اور تاکید مزید کر کے روانہ ہوئے۔

جب تک مسٹر احمد نواز عبدالستار کے مکان تک نہ پہنچ گئے۔ تب تک دم نہ لیا۔ یہ دیوان خانے میں قدم رکھنے ہی کو تھے۔ کہ ان کے کان میں سوز و گداز سے بھری آواز کان میں آئی۔ غور کیا تو عبدالستار کا آواز سنا۔ کہ وہ یہ غزل کہہ رہے تھے۔

غزل عابد

میری آنکھوں میں ہر دم شوخ کی تصویر پھرتی ہے
کلیجے میں غضب ہر دم میرے شمشیر پھرتی ہے
ملیں مدت کے بچھڑے ہم باہم شکوہ شکایت ہو
یہی حسرت ہے اب دیکھیں کہ کب تقدیر پھرتی ہے
رحم کے نام سے ناآشنا تو تو ستمگر ہے

بجائے لطف کے ظالم تیری شمشیر پھرتی ہے
سنا ہے آتے آتے رہ گیا وہ میری تربت پر
اسی باعث سے روح عابدی میری دلگیر پھرتی ہے

جب یہ غزل کہہ چکا۔ تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اور یہ تقریر مسلسل شروع کی
عبدالستار۔ آہ جب کسی پر بُرے دن آتے ہیں۔ تو یار آشنا کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ افسوس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ کل کی بات ہے۔ کہ احمد نواز ہمدردی کا وعدہ کرتا تھا۔ آج وہ بھی دیکھو۔ ملنے کا روادار نہیں۔ اب بھروسہ کروں تو کس پر کروں۔ ماں باپ بیچارے پوچھ پوچھکر اُکتا گئے ہیں۔ مگر میں نے ان سے بھی ابھی تک یہ اپنا واقعہ بیان نہیں کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ مجھے احمد نواز پر پورا بھروسا تھا۔ کہ وہ دانا ہے۔ عقلمند ہے۔ میرا کام وہی سر انجام کریگا۔ افسوس میری تمام امیدیں ایک دوست کے جدا ہونے سے خاک میں مل گئیں۔ او بے وفا احمد نواز ایک دفعہ تو مل کہ رو برو شکوہ و شکایت ہو پھر چاہے نہ ملنا۔

اب تو احمد نواز سے نہ ٹھہرا گیا۔ جھٹ پٹ دروازے کو کھٹکھٹایا۔ یہ آواز سن کر ہوشیار ہوا۔ اپنا آپ درست کیا۔ اور دروازہ کھولا۔
عبدالستار۔ آہ بھائی احمد نواز ہیں۔
احمد نواز۔ جناب واقعی غلام ہی ہے۔
عبدالستار۔ کس لئے تشریف لائے۔ او میرے بے وفا دوست کس طرح آئے۔
احمد نواز۔ بیوفا تو بیشک ہوں۔ مگر تمہارے لئے۔ اپنے لئے تو میں باوفا ہوں۔
عبدالستار۔ جی جناب خاص اپنی ہی ذات کے لئے باوفا ہو۔ تو دوسرے کو کیا۔ (جوش غضب سے اِدہر اُدہر ٹہلنا شروع کیا)
احمد نواز۔ بھائی بیٹھو تو کیا واللہ ابھی تک ناراض ہو؟
عبدالستار۔ ناراض بے شک ناراض تم سے بے وفا سے ناراضگی ہی بہتر ہے۔
احمد نواز۔ کب تک۔

عبدالستار۔ بس ہمیشہ کے لئے۔
احمد نواز۔ نہیں یار اب تو صلح کر لو۔ دیکھو دوستوں سے خفگی اچھی ہوتی ہے
عبدالستار۔ میں تم سے بے وفا کو دوست نہیں سمجھتا۔
احمد نواز۔ خیر کچھ سمجھو۔ بیشک میرے سے چند یوم کے نہ ملنے سے بے وفائی ہو۔ مگر الحمدللہ کہ کوئی قصور تو نہیں سرزد ہوا۔
عبدالستار۔ او بے وفا تمہارے لئے کوئی قصور ہی نہیں؟ مجھے عشق کے روگ نے اندر ہی اندر گھلا ڈالا ہے۔ کیونکہ تجھ جیسے بے وفا دوست کے جھوٹے وعدوں پر اعتبار کرتا رہا۔ اب تک یا جاناں تک پہنچ گیا ہوتا۔ یا اس دنیا کی بے ثباتی پر افسوس کرتا ہوا کوچ کر جاتا۔ مگر افسوس تیرے جھوٹے وعدوں نے مجھے اس حالت پر پہنچا دیا ہے۔ پھر جناب فرماتے ہیں کہ کچھ قصور تو نہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ اور کیا قصور ہوتا ہے۔ کہ ایک بندۂ خدا کو جھوٹے وعدوں پر انکار کہنا۔ اور بعد میں تنہا چھوڑنا۔ واللہ اس سے زیادہ کوئی قصور نہیں۔
احمد نواز۔ بیشک سچ فرمایا میں مانتا ہوں۔ مگر جناب میرے وعدے ایسے نہ تھے جو رنگ نہ لاتے۔
عبدالستار۔ واللہ کیا بیہودہ گفتگو کر رہے ہو۔
احمد نواز۔ تم بیہودہ سمجھو مگر میں تو تمہارے فائدے کو کہتا ہوں۔ ارے بھائی ٹہلنا تو موقوف کرو۔ ذرا کرسی پر تو بیٹھو۔
عبدالستار۔ بس بس میں تمہاری گفتگو سننا ہی نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی تم سے بیوفا کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔
احمد نواز۔ بھائی ابھی ابھی تو تم مجھے یاد کر رہے تھے۔ مگر اب مجھ سے بولنے کے بھی روادار نہیں۔
عبدالستار۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ تم کو میں یاد کر رہا تھا۔ اور ایک بار ملنے کی آرزو کی تھی۔ اب میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ اور حکم دیتا ہوں۔ کہ آپ بھولے سے بھی

میرے غریب خانے پر تشریف نہ لاویں بے وفا دوست تم نے مجھے تباہ کیا دیکھ زہر ابھی کھاؤنگا۔(پڑیا دکھادی) ہاں تو آپ کو اب تشریف لے جانا چاہیے۔

احمد نواز۔(نہائیت نرمی سے) بھائی خدا کے واسطے مجھے مایوس نہ کرو۔ خدا کی قسم تمہارے لئے ایک خوش خبری لایا ہوں میرے پیارے دوست مجھے معاف کرنا۔ آئندہ ایسی غلطی نہ سرزد ہوگی۔

عبدالستار۔خوش خبری؟ نہیں نہیں میں نہ مانوں گا تم اور خوش خبری۔

احمد نواز۔واللہ خوش خبری۔خوش خبری بھی وہ خوش خبری۔کہ تمہارا مرجھایا ہوا نخل امید از سر نو سر سبز ہوگا۔

عبدالستار۔بے اعتنائی سے) اچھا کہو میں سُن رہا ہوں۔

احمد نواز۔قبل اس کے کہ میں سلسلہ گفتگو شروع کروں معافی کا خواستگار ہوں۔

عبدالستار۔احمد نواز مجھے افسوس آتا ہے۔کہ تم دانا ہو کر اسقدر بے وفا بن گئے۔ کہ پھر سدھ بھی نہ لی۔

احمد نواز۔سب کچھ عرض کرونگا۔مگر پہلے میں آپ کے دہانِ مبارک سے لفظ معافی . . . . سننا چاہتا ہوں۔

عبدالستار۔معافی تو نہ دونگا۔البتہ تم اپنا عذر پیش کرو۔

احمد نواز۔بھائی تمہارا کہنا بیشک درست ہے۔یہ تو آپ کو معلوم ہے۔کہ میری بھی قسمیہ عرض ہے۔کہ میں شادی کے بعد ایسے اہم معاملوں میں پھنس گیا تھا۔کہ بمشکل کھانا کھانے کی فراعنت پاتا تھا۔تمام حساب کتاب اباجان نے میری ہی سپرد کر دیئے تھے۔ابھی بھی کام سے فرصت نہیں ہوئی۔مگر آج آپ کا خط ملا۔ کہ قدمبوسی کے لئے آگیا۔

عبدالستار۔بہتر ہے۔پہلے جاؤ۔اور فراعت حاصل کرکے تشریف لانا۔

احمد نواز۔خیر واللہ۔کیا کرتے ہو۔لو پہلے وہ خوش خبری تو سنو۔

عبدالستار۔اچھا سنا میں سنتا ہوں۔

احمد نواز۔ آج رات کو میں آپ کا خط پڑھ رہا تھا۔ اور ملنے کے لئے بیقرار تھا۔ کہ آپ کی بھابی صاحبہ تشریف لائیں۔ اور مجھے رنجیدہ دیکھکر کہنے لگی۔ آپ اُداس کیوں ہو۔ میں بلا تامل آپ کا خط اس کے روبرو پیش کر دیا۔ جسکو انہوں نے غور و فکر سے پڑھا۔ اور بیقرار سی ہوگئیں۔ میں اُن کی یہ حالت دیکھکر متحیر تھا۔ کہ انہوں نے وہ قصہ میرے سے سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے من وعن تمہارا واقعہ اس کے روبرو دوہرا دیا۔ اور نام مطلقاً نہ ظاہر کر سکا بعد میں وہ نام پوچھنے کے درپے ہوئیں۔ دوست سچ عرض ہے۔ کہ میں اُن کی اس حرکت سے ناخوش ہو رہا تھا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ان ہی حرکتوں میں مخفی خزانکی تہ کو پہنچنا ہے۔

خیر میں نے بصد مشکل بھائی افتخار اور سید حاتم علی کا نام لیا جسکو سن کر اسکا چہرہ کندن سا سرخ ہوگیا۔ اور خدا جانے جوش مسرت سے کیا کیا کیا۔ مجھے اس وقت یاد نہیں۔

خیر میں نے سبب پوچھا۔ تو کہا۔ کہ اپنے دوست ستار کو خوشخبری دو کہ جسکی زلفوں میں تم اسیر ہو۔ وہ خود تمہاری دلدادہ اور تیر مژگان کی گھائل ہے۔

عبد الستار۔ یہ تواب اور انکل پچو کرکے سنا دیا۔ اے بھائی معاف رکھو۔ میں ایسی باتیں نہیں سنتا۔

احمد نواز۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم۔ سر مُو جھوٹ نہیں۔

عبد الستار۔ تو کیا تم نے جو یہ واقعہ مجھے سنایا ہے سچ کہا ہے۔

احمد نواز۔ بے شک میں نے سچ عرض کیا ہے۔

عبد الستار۔ مجھے یقین نہیں۔

احمد نواز۔ خود ہی آجاوے گا۔

عبد الستار۔ کیسے۔

احمد نواز۔ جب تمہاری جاناں کا خط خاص اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا آویگا۔

عبد الستار۔ تب بیشک میں یقین کرونگا۔

احمد نواز۔ سب جھوٹ سچ عیاں ہو جائیگا۔ مثل مشہور ہے۔ جھوٹ کبھی چھپا نہیں رہتا۔
عبدالستار۔ خط کی کب تک انتظار کروں۔
احمد نواز۔ کل اسوقت تک۔ کیونکہ میں بیوی صاحبہ کو وہاں جانے کی تاکید مزید کر آیا ہوں۔ اب وہ صبح جاوے گی۔ اور تمام حال اس کشتۂ فراق کو کہیگی۔ تب وہ خط تحریر کرے گی۔ اور شام کو لیکر گھر کو لوٹے گی۔ اور پھر کل رات میں خط تمہارے پاس لاؤنگا۔
عبدالستار۔ مگر وہ تو مجھے جانتی بھی نہیں۔ خط کیسے تحریر کرے گی۔ شاید تمہاری بیوی نے بات بنا کر سنادی ہو۔
احمد نواز۔ نہیں نہیں میری بیوی کبھی جھوٹ نہ کہے گی۔ بھلا اسمیں اسکی کون سی بہتری تھی۔ کہ جھوٹ کہتی۔
عبدالستار۔ اس نے مجھے کہاں دیکھا۔
احمد نواز۔ جب ہم جلسے کے روز کلائی ہی کلائی ڈالے کمرے میں گھُسے تھے۔ اس وقت آپکی معشوقہ اوپر کے روشندان میں جلوہ فرما تھی۔ بس جناب اس وقت سے تمہاری تیر نظر کی قید ہو چکی ہے۔
عبدالستار۔ مگر تمہاری بیوی کا اس سے کیا تعلق۔
احمد نواز۔ تمہاری معشوقہ اور میری بیوی سکول میں اکٹھی تعلیم پاتی رہی ہیں۔ کینیرڈ (Kinniard) ہائی سکول میں انہوں نے انٹرنس پاس کیا ہے۔ دوسرا آپس میں رشتہ دار بھی ہیں۔ آپ کی معشوقہ نے تمام حال میری بیوی سے بیان کیا تھا اور اُس نے قسم کھائی تھی۔ کہ وہ اس کام کو سرانجام پہنچائیگی۔ سو خدا کے فضل سے وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی۔
عبدالستار جلدی سے اٹھا اور ہاتھ باندھکر احمد نواز کے سامنے کھڑا ہو کر معافی کی استدعا کرنے لگا۔ جس کے جواب میں احمد نواز اٹھا۔ اور چھاتی سے لگا کر کہا۔ کہ کیوں شرمندہ کرتے ہو بھائی تم نے کونسی غلطی کی ہے جس کے عوض معافی مانگتے ہو۔

عبدالستار۔ یہی کہ بجائے آؤ بھگت کے میں نے تمہاری بے حرمتی کی۔ خدا کے لئے منہ سے کہدو۔ کہ اے ستار میں نے تیرا قصور معاف کیا۔

احمد نواز نے کہدیا۔ اور اب دونوں دوستوں نے ادہر ادہر کی گپ شپ اڑانی شروع کیں۔ ناظرین بہتر ہے کہ اب انکو یہاں ہی چھوڑ دیں۔ اور تھوڑا آرام کریں۔ کہ صبح کو حسن وصفیہ کا حال دریافت کرنا ہے۔

صفیہ و حسن افروز

صفیہ کے لئے صبح ہی سے تمام سامان تیار ہے۔ ممن سویرے ہی سویرے وہ سامان خرید لایا ہے۔ جو کہ صفیہ خانم کو حسن افروز کے لئے لیجانا مقصود تھا۔ اسی حالت صبح کے نو بجنے والے ہیں۔ تمام طلبار سکول کو روانہ ہوئے ہیں۔ صفیہ نے ماما شبراتن کو ڈولی کے لئے بھیجا جس نے ممن کی معرفت ڈولی منگوائی۔ جب ڈولی دروازے پر آن موجود ہوئی تو صفیہ خانم کے لئے پردے کا سامان کیا گیا۔ اور صفیہ خانم اس میں سوار ہو گئی۔ اور کہاروں نے ۱۰ ہی منٹ میں ڈولی کو حسن افروز کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ماما بسم اللہ نے پردے کا انتظام کیا۔ اور صفیہ خانم کو ڈولی سے نکالا۔ صفیہ خانم ڈولی سے نکلتے ہی شپاشپ زینہ طے کر کے حسن افروز کی والدہ بہرور بانو سے نہایت ہی تپاک سے جا ملی۔ چند منٹ توقف کر کے حسن افروز کا حال دریافت کیا۔

صفیہ خانم۔ کہئے چچی جان میری پیاری سہیلی تو اتنے دن خوش رہیں۔

بہرور بانو۔ بیٹیا آجکل وہ کچھ ملول سی رہتی ہے نہیں جانتی۔ کہ کیا باعث ہے بیٹی باوجودیکہ اتنی دولت کے ہونے کے حسن افروز کیوں ان دنوں ناخوش نظر آتی ہے۔ اس کے والد نے تمام سامان اسکے لئے بہم پہنچا دیا ہے۔ مگر وہ دن بدن

لاغر سی معلوم ہوتی ہے۔

صفیہ خانم۔ مگر اس وقت ہیں کہاں۔

بہرور بانو۔ بیٹی اپنے کمرے میں ہے۔ اب تو پہروں انتظار کرو پھر بھی اسکا چاند سا مکھڑا دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

صفیہ خانم۔ میں ابھی جا کر اُن سے تمام حال پوچھونگی پھر انشاءاللہ آپ کو عرض کرونگی۔ لیجئے اب میں جاتی ہوں۔

اتنا کہتے ہی صفیہ خانم جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی حسن افروز کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ جا کے دیکھا تو اس حسن کی دیوی کو جسکو اب غم کی دیوی کہنا مناسب ہوگا۔ خواب ناز میں مشغول ہے پہلے تو ارادہ کیا۔ کہ سوئی رہنے دے مگر دل کی اُلجھن نے مجبور کیا کہ اسکو بیدار کرے۔ چنانچہ حسن افروز کو آہستہ سے ہلایا۔ کہ وہ یکبارگی چونک پڑی۔ بیچاری غم کی ماری قریباً پندرہ بیس منٹ سوئی ہوگی۔ کیونکہ تمام شب فراق عبدالستار میں روتے تڑپتے تلملاتے کاٹی ہے۔

جب آنکھیں کھولیں تو اپنے بالمقابل صفیہ خانم جان سے عزیز سہیلی کو کھڑا پایا۔ جھٹ پٹ اُٹھ بیٹھی اور دست پنجہ لیا۔ اور جس پلنگ پر خود لیٹی تھی صفیہ خانم کو بٹھایا اور کہا۔

حسن افروز۔ آہ میری پیاری سہیلی کس طرح آج میرے تاریک گھر کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے منور کیا۔

صفیہ خانم۔ جان من تمہاری اُلجھن مجھے ہر روز تنگ کیا کرتی تھی۔ دوسرا تمہاری حالت مدنظر تھی۔ اسلئے تمہیں دیکھنے کو آن موجود ہوئی۔ مگر ہاں کیا نماز صبح بھی ادا کی ہے۔ یا نہیں۔

حسن افروز۔ ہوا میں نے صبح ہی صبح نماز و قرآن شریف پڑھ لیا ہوا ہے۔ بھلا یہ چیزیں کب چھوٹ سکتی ہیں۔ شام سے صبح تک نیند نہیں آتی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں تمام رات بسر ہو جاتی ہے۔ مگر ہاں میری پیاری سہیلی مجھے اسلئے تھی۔

ملاقات ہو جائے گی۔ مگر میرا خیال برعکس ثابت ہوا۔ دولھامیاں نے تمہیں کیسے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی اجازت دے دی۔

صفیہ خانم۔ بھلا دیتے کیوں نہ۔ جب کہ میں اپنی عزیز سہیلی سے ملنے کی شایق تھی۔ میں نے یونہی ہنسی ہنسی میں کہا۔ انہوں نے اسی وقت مان لیا۔

حسن افروز۔ تب تو میں خوش قسمت ہوں۔ کہ تمہیں دولھامیاں نے میرے ملنے کو اجازت دے دی۔

صفیہ خانم بہن سچ تو یوں ہے۔ کہ اگر پردۂ دنیا پر میرے شوہر جیسا ڈھونڈا جاوے تو ملنا دشوار ہے۔ قسمیہ عرض ہے۔ کہ مجھے از حد الفت و پیار سے رکھتے ہیں۔ اُدھر میرے منہ سے نکلا ادھر انہوں نے بہم پہنچا دیا۔ بہن اور بھی بہت باتیں ہیں۔ کیا بتاؤں۔ بس اتنا ہی کہدینا کافی ہے۔ کہ نہایت ہی بھلے مانس ہیں۔

حسن افروز۔ اسی بات سے تو اُنکی مہربانی عیاں ہوئی جاتی ہے۔ کہ انہوں نے مجھ سے ملنے کی تمہیں اجازت دے دی۔ بھلا اتنے تھوڑے عرصہ میں کب کسی کا شوہر باہر نکلنے کی اجازت دیتا ہے۔

صفیہ خانم۔ اب سہیلی ذرا اپنی طبیعت کا حال تو سناؤ کہ کس طرح گذرا۔

حسن افروز۔ نہایت ہی بُری طرح۔ بہن یہ دیکھو جسکو تم حسن میں لاثانی کہا کرتی تھیں آج آزار عشق سے نحیف مانند بوڑھوں کے ہے۔ آہ اس آزار عشق سے بہتر تھا۔ کہ میں اس عالم شباب سے پہلے ہی پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر جاتی۔ افسوس یہ گھل گھل کر مرنا تو نصیب نہ ہوتا۔

صفیہ خانم۔ بہن افروز بالکل سچ کہا۔ مگر دیکھو ناامید نہ ہو۔ وہ کارساز ہے۔ عنقریب وہ دن آنے والا ہے۔ کہ تم اپنے مطلوب سے ملو گی۔ رنج نہ کرو۔ اُف دیکھو اس رنج نے تمہیں کس قدر دُبلا کر دیا ہے۔

حسن افروز۔ صفیہ۔ آہ یہ رنج خدا ہی دور کرے۔ واللہ یہ میرے مکان سے بعید ہے۔ بہت دفعہ دل کو سمجھاتی ہوں۔ کہ ایک اجنبی پر فدا ہونا گویا ناموس کو

دھبّہ لگاتا ہے۔ خاندان کا نام ڈبوتا ہے۔ مگر آہ جس قدر اس دل ناشاد کو سمجھاتی ہوں۔ اتنا ہی ترقی پکڑتا جاتا ہے۔

صفیہ خانم۔ میری جان یہ غم و رنج یہ فراق کی گھڑیاں عنقریب گذارا چاہتی ہیں مجھے اس کی ذات بابرکات سے ہرگز ہرگز ناامید نہ ہونا چاہئے۔ دیکھو اور امید رکھو۔ کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

حسن افروز۔ اب تو واللہ بہت انتظار کر چکی۔ سچ پوچھو تو عنان صبر ہاتھ سے چھوٹ چکی ہے۔ اب تھامنا اختیار میں نہیں ہے۔

صفیہ خانم۔ افروز کیا تمہیں معلوم ہے۔ کہ میں آج کے لئے بغیر اطلاع دئے تمہارے دولت خانے پر آئی میرا آج کا آنا خالی از علّت نہیں۔ مگر قبل اس کے کہ میں تمہیں کچھ فرحت افزا خبر سناؤں تم مجھے بشاش نظر آؤ۔

حسن افروز۔ بشاش نہیں نہیں بشاش نظر آنا اب میرے نصیب میں کہاں آہ میری خوشی۔ آرام۔ چین تو وہ ظالم اپنے ساتھ لیگیا۔ اب تو وہ ہی میرا سکھ چین واپس دیگا تو فبہا ورنہ جیسے گذرے گی گذاروں گی ؎

مجھ پہ گذرےگی صنم جیسی گذارونگی میں
ہائے مگر تم نہ کبھی شکل دکھانا آکر

صفیہ خانم۔ پیاری ہیلی سنو۔ خوب غور سے سنو۔ کہ میرا آج یہاں وارد ہونا خالی از علّت نہیں۔ تم میرے کہنے کو سچ جانو۔ اور آج تم مجھے فرشتہ رحمت سمجھو۔ کہ تمہارے مردہ دل کو زندہ کرنے آئی ہوں۔

حسن افروز حیرت سے صفیہ خانم کا منہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی سہیلی کیا کہہ رہی ہے۔ چاہا کہ ایسا کرنے سے اُسے باز رکھے۔ مگر مہر سکوت ایسا لگا۔ کہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ آخر صفیہ خانم نے اسکو ہراساں دیکھکر پھر کہا۔

صفیہ خانم۔ ہاں پیاری تم ہراساں ہو۔ کہ یہ میں کیا بک رہی ہوں۔ پیاری سہیلی آج میں وہ خوش خبری لائی ہوں۔ کہ جس کی تم مدت سے خواہشمند تھی۔

اور جسکے پورا کرنیکا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ سو شکر ہے۔ کہ میں اپنے وعدے سے سبکدوش ہو گئی۔

حسن افروز۔ بہن صفیہ آخر کچھ کہو گی بھی یا نہیں۔

صفیہ خانم۔ جان من جس کے لئے تم بیقرار تھیں۔ وہ خود تمہارے گیسوؤں میں اسیر ہے۔

حسن افروز۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ بہن للہ ٹھٹھا نہ کرو۔

صفیہ خانم۔ حسن افروز میرے کہنے کو سچ مانو۔ سچ مانو۔ تم میری عادت سے خوب واقف ہو۔ کہ میں نے تمہارے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور نہ ہی بولوں گی۔

حسن افروز۔ اعتبار تو مجھے ضرور تم پر ہے۔ مگر اعتبار نہیں آتا۔ خیر ذرا اچھی تشریح کے ساتھ بیان کرو۔

صفیہ خانم۔ بیشک اگر تم اس واردات کے سننے کی مشتاق ہو تو سنو۔ کہ رات اُنکے پاس (صفیہ کا شوہر) ایک خط آیا۔ پیاری وہ خط کس کا تھا۔ وہ خط خاص تمہارے ہی محبوب کا تھا۔

حسن افروز۔ محبوب کا۔

صفیہ خانم۔ ہاں ہاں محبوب کا محبوب کا۔ خیر آگے سنو۔ میں نے اُنکو دیکھا۔ تو وہ ہراسان تھے۔ میں نے سبب پوچھا۔ تو بجائے اسکے کہ وہ مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔ انہوں نے وہی خط میرے سامنے کر دیا۔ میں نے بصد اصرار اسکو پڑھا افروز سچ کہتی ہوں۔ کہ ایسا سوز و گداز کا خط تھا کہ بیان نہیں کر سکتی۔ واللہ مجھے اس کے پڑھنے سے رقّت طاری ہو گئی تھی۔ اور تم مجھے یاد آئیں۔ کہ اس شخص کا تمہارا ہی حال ہے۔ جب میں نے نیچے نام پر نگاہ کی تو تمہارے محبوب یعنی عبدالستار کا نام لکھا پایا۔

حسن افروز۔ آئیں عبدالستار کا۔ آہ آہ میری جوانی خاک میں مل گئی۔ اُف دنیا سے نامراد ہی چلی۔ بس بہن بس اب تم مجھے میرے ہی حال پر چھوڑ دو۔

صفیہ خانم۔ بوا افروز سنو تو سہی۔ آدھی تقریر سن کر ہراساں ہو گئی۔ خدا کے

لئے آگے بھی تو سُنو۔

حسن افروز۔ اچھا کہو سُن رہی ہوں۔

صفیہ خانم۔ بہن جب میں نے وہ نام پڑھا۔ تو مجھے ہر طرف یاس اپنی ڈراؤنی صورت دکھلانے لگی۔ اور مایوس کرنے لگی۔ بُوا میں اس وقت کا حال بیان نہیں کرسکتی۔ اگر تم خود ہوتیں۔ تو میری حالت کو ملاحظہ کرلیتیں۔

خیر میں نے پھر اصرار سے پوچھا۔ کہ عبدالستار کس کے عاشق ہیں۔ خدا خدا کرکے انہوں نے مجھے تمام حال سنایا۔

حسن افروز۔ میں بھی سنوں کہ کیا کہا تھا۔

صفیہ خانم۔ یہ ہی کہ عبدالستار ماہ اگست ۱۹۲۲ء کو اپنے دوست مسٹر افتخار احمد کو اسٹیشن پر لے گئے۔ کہ وہ عرصہ تین سال کے بعد لاہور میں تشریف لائے تھے۔ اور اُن کے ساتھ اُنکی والدہ اور ہمشیرہ بھی تھیں۔ جو سیاہ برقعہ اوڑھے تھی۔ اور برقعے سے اس کی ایک سفید انگلی نکلی تھی۔ کہ جس پر عبدالستار کا دل چھل گیا۔ سو میری فرزند تمہارا محبوب تم سے بھی پہلے تمہارا عاشق ہے۔ اب تم ہی سوچو۔ کہ کیا تم ہی اُس دن کلکتہ سے آئی تھیں۔

حسن افروز۔ (کچھ حساب کرکے) ہاں ہاں ہم ہی اس تاریخ کو لاہور آئے تھے۔

صفیہ خانم۔ اور کیا تمہارا برقعہ سیاہ تھا۔

حسن افروز۔ ہاں ہاں سیاہ تھا۔ وہ دیکھو کھونٹی پر لٹکا ہوا ہے۔

صفیہ خانم نے دیکھا تو واقعی سیاہ برقعہ ٹانگا تھا۔ اور کہا۔

صفیہ خانم۔ کہو اب بھی اعتبار آیا ہے یا نہیں۔

حسن افروز۔ ہاں اب کچھ اعتبار آ تو گیا ہے۔ مگر اب کیا کیا جائے (تمام چہرہ مارے خوشی کے دمکنے لگ جاتا ہے)

صفیہ خانم۔ یہ ہی کہ تم اسکو ایک خط تحریر کرو۔ کہ جسمیں اپنی محبت کا اظہار ہو۔ کیونکہ میں اپنے شوہر کی زبانی سنتی ہوں۔ کہ اسکا عشق حد سے زیادہ تجاوز

کر چکا ہے۔
حسن افروز۔ صفیہ کیا میرے سے زیادہ۔
صفیہ خانم۔ اُس کے خط سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔
حسن افروز۔ تو کیا اب مجھے خط لکھنا چاہیے۔
صفیہ خانم۔ ہاں ہاں ضرور لکھنا چاہیے۔
حسن افروز۔ یہ تو میرے سے نہ ہوگا۔ کہ خط لکھوں۔
صفیہ خانم۔ تو سمجھو کہ اس بگیناہ کا خون تمہارے سر پر ہوگا۔ کیوں کہ وہ ہر وقت زہر کی پڑیا پاس رکھتا ہے۔ اگر حسن افروز تم نے تامل کیا۔ تو سمجھو۔ کہ وہ تم پر فدا ہو جائیگا اس کے لئے مسیحا تم ہی ہو۔
حسن افروز۔ آہ میرا محبوب میرے لئے جان دینے کو طیار ہے۔ آہ اگر وہ مر گیا تو میرا جینا بھی دشوار ہے۔ بہتر ہے۔ کہ خط لکھدوں۔ کیونکہ خط و کتابت بھی نصف ملاقات کے برابر ہے۔
صفیہ خانم۔ ہاں اگر تمکو اپنی زندگی اور اس کشتۂ فراق کی زندگی کا پاس ہے۔ تو خط تحریر کردو۔
حسن افروز۔ انکار تو نہیں۔ مگر ایسا نہ ہو۔ کہ کسی اور کے ہاتھ میں آجاوے۔ اور مفت میں شرمندگی اُٹھانی پڑے۔
صفیہ خانم۔ اس بات سے تم مطمئن رہو۔ کیونکہ خط میرا شوہر تمہارے محبوب کے پاس لے جائے گا۔ سو پیاری اس سے بڑھکر اور کوئی اچھا قاصد نہیں۔
صفیہ خانم اتنا کہکر خاموش ہوگئی۔ اور حسن افروز اٹھی۔ اور میز کی طرف لپکی۔ قلم اٹھا کر خط تحریر کرنے لگی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے پیارے محبوب سلامت تا قیامت رہو۔
افسوس جب سے تم نے مجھے اپنی صورت خوش دکھائی ہے۔ تب سے

تمہاری اُلفت کی برچھی میرے سینہ و دل پر کاری لگی ہے۔ کہ جس سے عیش و عشرت کی زندگی میرے لئے بسر کرنی ایسی ہی نہیں۔ میری جان سے پیارے ستار تم سے میرا گلا و شکوہ کیا ہو سکتا ہے۔ یہ سب اپنی قسمت کا لکھا بھگت رہی ہوں۔ اسمیں تمہارا کچھہ قصور نہیں۔ میرا ہی قصور ہے کہ تمہاری پیاری صورت دیکھتے ہی دل پہلو سے جاتا رہا۔

اُف اُف پیارے میں ہی جانتی ہوں۔ کہ جو جو ستم میں نے عشق میں قدم رکھنے سے اُٹھائے ہیں۔ خدا یہ روگ دشمن کو بھی نصیب نہ کرے آج عرصہ چھ مہینے کا گذر چکا ہے۔ کہ میرے لئے نیند۔ آرام حرام ہو چکا ہے۔ ہر وقت سوتے جاگتے اُٹھتے بیٹھتے تمہارا ہی گیت ورد زبان ہے۔ اور تمہاری پیاری پیاری صورت ایکدم آنکھوں سے نہاں نہیں ہوتی ؎

آئینہ بھی گر میں دیکھوں پر نظر آتا ہے تو
دل میں نقشہ جم گیا ہے حسن کی تصویر کا } عابد

کوئی ایسا وقت نہیں۔ کہ تمہاری یاد دل سے چوکے۔ پیارے عورت کے ہونے سے مجبور ہوں۔ ورنہ سائل بن کر تمہارے در آکر دیدار کی ایک جھلک کا سوال کرتی۔ خدا کے واسطے کبھی کبھی تو ہمارے بازار سے گذرا کریں۔ کہ میں آپ کی صورت خوش کو دیکھکر اپنے دل پژمردہ کو مسرور کروں۔ دل تو چاہتا ہے۔ کہ تمہیں لحہ پر جدا نہ کروں۔ مگر شرم و حیا مانع ہیں۔ دوسرا قید اسلام سے مجبور ہوں۔ اس لئے تمہیں کوئی موقع ملنے کا نہیں دیتی۔ امید ہے۔ کہ تم اسی طرح مجھہ عاجز سے خط و کتابت جاری رکھوگے۔ والسلام

راقمہ
حسن آفروز۔ مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۲۳ء

حسن افروز نے پھر اُس خط کو پڑھا۔ اور صفیہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسکو اُس نے غور سے پڑھا اور کہا۔

صفیہ خانم - بہن نہایت عمدہ مضمون ہے - بس اب اسکو بند کر دو - کہ جاتی دفعہ ساتھ لیتی جاؤں -

حسن افروز نے خط کو نہایت ہی احتیاط سے ایک خوشنما لفافے میں بند کر دیا - اور خوشبو لگا دی - کہ اپنے عاشق کی مشام جان تازگی پکڑے -

آخر کرتے کراتے سورج افق مغرب میں تیاری کرنے لگا - آسمان نے کسی نئی دلھن کی طرح بادلوں کا سرخ دوپٹہ پہن لیا ہے - شرمائی ہوئی نگاہوں سے آسمان سورج کو دیکھ رہا ہے -

اتنے میں سورج غروب ہو گیا - دونوں سہیلیوں نے پہلے نماز مغرب ادا کی - پھر ماما بسم اللہ کو کھانا لانے کی تاکید کر دی گئی -

تھوڑی دیر بعد کھانا دسترخوان پر چن دیا گیا - اور انہوں نے کھانا شروع کیا - کھانے کے بعد ماما بسم اللہ نے ہاتھ دھلائے - اور ایک ایک گلوری دونوں کو دی تو صفیہ نے کہا -

صفیہ خانم - حسن افروز اب ہمیشہ ہماری ماما تمہارے پاس آیا کریگی - اس سے خط لیکر جواب دے دیا کرنا -

حسن افروز - بہت بہتر انشاءاللہ ایسا ہی کیا جاویگا -

حسن افروز اتنا کہنے پائی تھی - کہ ماما بسم اللہ نیچے سے بھاگی ہوئی آئی اور کہنے لگی -

ماما - حضور صفیہ صاحبہ کے لئے نیچے ڈولی کھڑی ہے - اور کہار جلدی تشریف لانے کو عرض کرتے ہیں -

اتنا سنتے ہی صفیہ جانے کے لئے تیار ہو گئی - دونوں گلے سے ملیں - تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے - بعد تھوڑی دیر کے دونوں الگ ہوئیں - صفیہ نے سلام علیک کہا - اور آخری نظر اپنی سہیلی حسن افروز پر ڈالی - اور کمرے سے نکل کر بہر دربانو سے ملی - اس سے ملکر سیدھی نیچے گئی - پردے کا انتظام تو پہلے ہی تھا - جاتے ہی ڈولی میں بیٹھ گئی اور گھر کو روانہ ہوئی -

آگے مسٹر احمد نواز صاحب انتظار کر رہے تھے۔ کہ کب بیوی آئے تو تمام حال منکشف ہو۔ چنانچہ صفیہ خانم بھی آگئی۔ تبسّم کرتی ہوئی اپنے عالی وقار شوہر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

احمد نواز۔ صفیہ کہو کیا خبر لائیں۔

صفیہ خانم۔ خدا کے فضل سے تمام کام بطرح سے سرانجام پہنچ چکا ہے۔

احمد نواز۔ یعنی.....

صفیہ خانم۔ یعنی کہ خط۔ اتنا کہتے ہی اس خط کو احمد نواز کے ہاتھ میں دیا۔ احمد نواز کی خط کو دیکھکر باچھیں کھل گئیں۔ اپنی بیوی کو تحسین و آفرین کی۔ اور کہا۔

احمد نواز۔ کہو کہ افروز نے کہا تو نہ تھا۔

صفیہ خانم۔ پہلے تو بیشک انکار کرتی رہی۔ بعد میں میرے کہنے سے خط لکھا۔ جو کہ آپ کے دست مبارک میں ہے۔

احمد نواز۔ تو اب میں جاتا ہوں۔ اور اس کشتۂ فراق کو یہ نامہ مسرت دیتا ہوں۔

اتنا کہتے ہی جلدی سے کمرے سے نکلکر نیچے اُتر گئے۔ اور بازار کا راستہ لیا۔ مگر افسوس مسٹر احمد نواز کو جلدی نہ چاہئے تھی۔ کہ جلدی کے آگے گڑھا ہوتا ہے۔

جب احمد نواز مسٹر عبد الستار کے کوچے میں پہونچے تو جیب سے خط نکالا۔ تاکہ جاتے ہی عبد الستار کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ کہ اچانک ایک تنگ کوچے سے ایک سیاہ لباس پہنے شخص نمودار ہوا اور مسٹر احمد نواز کی آنکھوں میں راکھ ڈالدی۔ اور لفافہ جو احمد نواز کے ہاتھ میں تھا لے اُڑا۔

مسٹر احمد نواز نے ہر چند کوشش کی۔ کہ اسکو پکڑلیں۔ مگر بوجہ نہ دکھائی دینے کے قاصر رہا۔

آہ انسان بعض موقعوں پر ایسا بے خود اور اندھا ہو جاتا ہے کہ کچھ نہیں سوجھتا۔ اگر اسوقت مسٹر احمد نواز صاحب بھی تحمل سے کام لیتے۔ تو کیوں اُنکو یہ وقت دیکھنا نصیب ہوتا۔

خیر اپنے پر مسٹر احمد نواز صد ہزار لعنت و ملامت کرنے لگا۔ اور پھر رہ کر تلاش کرنے لگا۔ کہ شائد وہ کہیں چھپا ہوا مل جاوے ہر چند رات کے بارہ بجے تک ڈھونڈا کئے۔ مگر اس سیاہ پوش کا کہیں سراغ نہ ملا۔ آخر رنجیدہ دلی سے گھر کو روانہ ہوئے۔ اور گھر میں پہنچتے ہی تمام ماجرا اپنی بیوی کو کہہ سنایا۔ جسے وہ سن کر بیہوش ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد صفیہ خانم ہوش میں آئی تو کہنے لگی۔

صفیہ خانم۔ آخر یہ کیا اسرار ہے اور وہ حرامزادہ کون شیطان کا بچہ ہے۔

احمد نواز۔ میری پیاری یہ ہی تو معلوم نہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو اس کا کیا مقدور تھا۔ کہ میرے سے لے جاتا۔ جہاں کہیں اسکا سراغ پا کر لے آتا۔

صفیہ خانم۔ افسوس تمام محنت رائیگاں گئی۔ آہ اب وہ بدذات خبر نہیں کہ اس خط سے کیا طوفان عظیم برپا کریگا۔

احمد نواز۔ بیشک اگر خیال ہے۔ تو حسن افروز بیچاری کا ہے۔ اگر میرا ہوتا۔ تو کبھی پرواہ نہ کرتا۔

صفیہ خانم۔ افسوس حسن افروز مجھے جھوٹی قرار دیگی۔ میری طرف سے اس کے دل میں شک ہو جائیگا۔ کہیں سہیلی ہو کر اسکے در پئے آزار ہوئی اور زبردستی خط تحریر کروایا۔

احمد نواز۔ اچھا پیاری اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ صبر کرو وہ مالک ہے۔ شاید اس نے اسی میں بہتری سمجھی ہو۔

اتنا سنتے ہی صفیہ خانم ماتھے کو پکڑے ہوئے غمگین چہرہ بنائے ہوئے اپنی چارپائی پر جا لیٹی۔ اور کروٹیں بدل بدل کر صبح کر دی۔ اور ادھر مسٹر احمد نواز تا صبح میز پر اس کا انجام سوچنے لگے۔

پر اسرار آدمی اور حسن افروز

رات کے بارہ بجے کا وقت ہے۔ تمام شہر لاہور سنسان پڑا ہے۔ آج تاریکی کا بھی وہ عالم ہے۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا۔ تمام بازار ویران سے معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی دکان اسوقت کھلی نہیں۔ البتہ پولیس مین (سپاہی) ہاتھ میں بانسی ڈنڈا پکڑے ہوئے ہیں۔ اور ہر پانچ منٹ کے بعد خبر دار ہوشیار باش کا آوازہ لگا رہے ہیں اس وقت جبکہ سپاہی اس کوچے سے جسکا ذکر اب ناظرین کے سامنے کیا جا رہا ہے گذرا۔ تو ایک شخص سیاہ اور کوٹ Over پہنے اور اس کے کالر سے تمام چہرہ ڈھانپے ہوئے نکلا۔ پولیس مین کو دیکھا۔ کہ اوہ کتنی دُور نکل گیا ہے۔

جب اس شخص کی تسلی ہو گئی۔ تو اپنے کوٹ سنبھالتا ہوا ایک طرف کو جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا چلدیا۔ قریباً بیس منٹ میں ایک تاریک کوچے میں جا گھسا۔ اور گھومتا گھامتا ایک مکان پر جا کھڑا ہوا۔ اور جاتے ہی دستک دی۔ جسکے ساتھ ہی ایک جوان نکلا۔ جسکو اگر نیم زنانہ کہا جاوے۔ تو بیجا نہیں۔

جوان۔ آیئے آیئے واللہ بہت راہ دکھائی۔ تین گھنٹوں سے متواتر تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔

نقاب پوش۔ دوست کیا کروں۔ موقعہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنا وقت ضائع ہو گیا ہے۔ ورنہ میں تو کب کا تمہارے مکان پر آنے کے لئے مستعد تھا۔

جوان۔ تو اب بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

نقاب پوش۔ بس تم یہاں پر میرا انتظار کرو اور میں اس رشک حور کو لئے جاتا ہوں یہیں اگر تم اس حور کو دیکھو گے۔ تو حیران ہو گے۔ اور وہ زنانہ مین بیٹھک میں تجھے دونگا۔ تاکہ تمہاری اس کے ساتھ عیش سے کٹے۔

جوان۔ دوست مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مبادا یہ راز پنہاں عیاں ہو جاوے۔ اور

میرے والدین کو خبر ہو جاوے۔ تب سچ کہتا ہوں کہ قیامت ہو گی۔
نقاب پوش ۔ کبھی عیاں نہیں ہو سکتا۔ تم کر ہمت باندھو۔ تو سمجھہ لو کہ تمام کام آسان ہیں۔ ہاں ذرا یہ راہ ٹیڑھی ہے۔ اس میں ہمت سے کام لینا پڑیگا۔
جوان ۔ اور تو مجھے کچھہ خوف نہیں ہے۔ تو صرف اپنی جایداد سے عاق ہونے کا خدشہ ہے۔ کہ جایداد خود میرے والد نے بہم پہنچائی ہے۔ اور انکا قول ہے کہ جب تک میں راہ راست نہ اختیار کرونگا۔ تب تک میں ایک حبہ کا حقدار نہیں۔
نقاب پوش ۔ تو کیا جایداد ایک پری سے بہتر ہے۔ جبکہ وہ تمہارے پہلو میں آوے گی۔ تو تمہیں روپیہ کی کچھہ ضرورت نہ رہے گی۔
جوان ۔ تو واللہ جلدی لاؤ۔ دیکھو میں اس پر عاشق جاتا ہوں بہئی اب مجھے غائبانہ عاشق کر کے راہ فراری نہ اختیار کرنا ورنہ سمجھہ لینا کہ میری زندگی کا خاتمہ ہے۔
نقاب پوش نہیں نہیں تسلی رکھو۔ یہ کام میں خاص تمہارے ہی لئے کر رہا ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ لو خدا حافظ۔

اتنا کہتے ہی نقاب پوش چوغہ سنبھالتے ہوئے سیدھا ایک طرف کو چلدیا۔ اور جاتے جاتے ہمارے مسٹر افتخار احمد کے گھر کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اور بنظر عمیق کبھی اِدہر اور کبھی اُدہر دیکھنے لگا۔ آخر جب کچھہ مطلب حل نہ ہوا۔ تو کوچے میں گھس گیا۔ وہاں جا کر بدستور اِدہر اُدہر نگاہ کی۔ اور چلایا۔ کہ ہاں وہ کھڑکی موقع کی ہے۔ یہ کہتے ہی کمند نکالا اور نہایت احتیاط سے پھینکا جو جاتے ہی خوشنما کھڑکی میں اٹک گیا۔ اسکو کھینچا تو مضبوط پایا۔ جب اچھی طرح سے آزما لیا۔ تو اوپر چڑہنا شروع کیا۔ کھڑکی میں پہنچکر آہستہ سے اسکو کھولا۔ جو قضا کار اس آدمی کے لئے کھلی رہ گئی تھی۔

جب اچھی طرح سے اِدہر اُدہر نگاہ کی۔ تو باچھیں کھل گئیں۔ کہ اپنے آپ کو جائے مقصود پر پایا۔ اور شکر کیا۔ کہ زیادہ تکلیف نہ اُٹھانی پڑی۔
ایک کمرے میں بجائے بجلی کے چراغ جل رہا تھا۔ جو کہ اپنی دھیمی دھیمی روشنی سے

تمام کمرے کو روشن کر رہا تھا۔ آہستہ سے نیچے اُترا اور مغرب کی سمت ایک پلنگ بچھا پایا۔ اور اس پر ایک نازنین خواب نازمیں مشغول تھی۔ ناظرین والاتمکین میں اس نازنین کے حسن کی کیا تعریف لکھوں قلم میں طاقت نہیں۔ کہ بیان کرے۔ اس نازنین کا مہتابی چہرہ چاند کی ہمسری کا دعوےٰ کرتا ہے۔ پیشانی صاف اور اٹھی ہوئی۔ ابرو نہایت باریک مانند کمان۔ بادام سی آنکھیں جو نیند کے خمار سے بند تھیں۔ ناک ستواں اور نازک دہان چھوٹا اور خوبصورت ٹھڈی چھوٹی جسمیں کہ نہائیت خوبصورت چھوٹا سا گڑھا۔ گردن صراحی دار۔ جس پر کہ سونے کا گلوبند بندھا تھا۔ اور جسکے گرد عنبرین زلفیں لٹک رہی تہیں۔ گویا کہ اس مہتابی چہرے کی محافظ تھیں۔ اللہ اللہ سینے کا ابھار اسقدر زور پر تھا کہ جس سے نوجوان کا دل بے اختیار پھسل پڑے۔ دایاں ہاتھ سر کے نیچے تھا۔ اور بایاں ہاتھ ان دو اناروں پر تھا کہ باغ حسن سے ان اناروں کو کوئی نہ توڑ سکے۔ باقی حصہ ایک خوشنما پھولدار رضائی میں چھپا تھا۔ خیر وہ نقاب پوش اس نازنین کے حسن خداداد پر عش عش کرنے لگا۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

آہ بھلا ستار کیوں نہ ایسی دلربا معشوقہ پر فدا ہوتا۔ جسکا حسن یکتائے عصر ہے میں نے ایسی حور آجتک نہیں دیکھی۔ میرے خیال میں حضرت یوسف علیہ السلام اس سے زیادہ کیا حسین ہو سکتے ہیں۔ اگر پردہ دنیا میں حسین ہے تو یہی نازنین ہے۔ نہیں معلوم کہ یہ روشنی اس منور چہرے کی ہے۔ یا اس چراغ کی ہے۔ نہیں نہیں یہ روشنی اُسی رشک آفتاب کی ہے۔ بیشک یہ اس کے منور چہرے سے کمرہ منور ہے۔ اور چراغ خود اسی کی روشنی سے روشن ہے۔ اے نازنین تو اس وقت خواب غفلت میں مدہوش ہے خبر نہیں۔ کہ کیا کیا اور کہاں کہاں سیر کر رہی ہے یقیناً تو میرے دشمن عبدالستار سے خواب میں ہم کلام ہو گی۔ اگر تیرا دل اس حرامی ستار کی طرف مایل نہ ہوتا۔ تو قسم ہے۔ خدا کی تجھے نقصان نہ پہنچاتا۔ اب مجبور ہوں کہ بغیر ایسا کئے میں عبدالستار سے بدلہ نہیں لے سکتا۔

اتنا کہتے ہی جیب سے رومال اور ایک شیشی نکالی۔ رومال پر اس شیشی سے کلوروفارم گرایا۔ اور نازنین کے رُخ تابان پر ڈالدیا۔ جسکی تیزی سے حسن افروز کے دماغ میں فتور پیدا ہوا۔ کروٹ بدلی اور بے ہوش ہو گئی۔

(راوی) آہ پیاری حسن افروز تو بیشک بدنصیب ہے۔ کہ بجائے وصال دلبر کے تو ایک نہائیت ہی شدید مصیبت میں گرفتار ہونے چلی ہے۔ تیرا خدا حامی و مددگار رہے۔ اور تمہیں باعصمت تمہارے گھر پر پہنچا دے

جب ہسٹری مین کو یقین ہو گیا۔ کہ حسن افروز بیہوش ہو گئی ہے۔ تو اس کو ایک سفید کپڑے میں باندھا۔ جو قریب ہی پڑا تھا۔ جب باندھ لیا۔ تو اُسکو اسی کمند کے ذریعے سے نیچے لٹکایا۔ اور بعد میں خود نیچے اُترا۔ اور اس گٹھڑی کو سر پر اُٹھائے ہوئے چھپتا چھپاتا حسن افروز کو لے گیا۔ جاتے ہی اس پہلے مکان پر دستک دی۔ جس سے ناظرین بخوبی واقف ہیں۔

دستک سُنتے ہی وہی پہلا نوجوان باہر نکل آیا اور پکارا۔ دوست لے آئے۔

نقاب پوش ۔ ہاں ہاں لے آیا۔ اب جلدی دروازہ کھولو۔ کہ نازنین شدت سردی سے مردہ سی بن رہی ہے۔ اس نوجوان نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ نقاب پوش جلدی سے اندر گھس گیا۔ اور جاتے جاتے تین کمرے طے کئے اور چوتھا کمرہ جو کہ بالکل تاریک تھا۔ جا کھڑا ہوا۔ گٹھڑی کو سر سے اُتارا۔ اور اس جوان کو رضائی کے لئے کہا۔ جس کے سُنتے ہی وہ جوان لپکا۔ اور ایک رضائی لے آیا۔

جب اس کی نظر حسن افروز پر پڑی تو دل پہلو سے جاتا رہا۔ اور نہائیت ہی بُرے اور فحش خیالوں میں محو ہو گیا۔ کہ ابھی یہ نقاب پوش جاویگا۔ تو اس نازنین سے ہمبستری کریگا۔ مگر نقاب پوش اس کے ہر ایک اشارے سے ہوشیار ہوتا جاتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا۔ کہ بیٹا یہ کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک حور شمائل کی عصمت کو تو دھبہ لگائے میں اس لئے تیرے پاس نہیں لایا۔ کہ تو اس کے ناموس کو نظر بد سے دیکھے۔

نقاب پوش ۔ کہو بھائی اب بھی میری بات پر یقین آیا ہے۔ یا نہیں۔

جوان - ہاں ہاں بھائی میری وہ زبان نہیں - کہ جس سے تیری اس مہربانی کا - کہ ایک حور پہلو میں لا بٹھائی شکریہ نہیں ادا کر سکتا -

نقاب پوش - تو میرے خیال میں تم جاکر اب سو رہو - کیونکہ علی الصبح ہم نے اسکو کہیں کا کہیں لے جانا ہے -

جوان - بھائی یہ کیا کہا واللہ کہیں ایسا غضب نہ کرنا میں تو بے موت مرجاؤنگا تو کیا تم مجھے اس نازنین سے محروم رکھو گے -

نقاب پوش - نہیں بلکہ کسی ایسی جگہ جاکر تجھے سونپونگا - کہ کوئی تیری ہوا کی طرف بھی نہ دیکھ سکے - یہاں پر خدشہ ہے - کہ ضرور اس لڑکی کے والد کو خبر ہو جاویگی - یا یہی نازنین ہمیں کسی طریقے سے پھنسا دے -

جوان - خیر جیسا مناسب سمجھو کرو بندہ حاضر ہے - مگر ہاں کہاں لیجانے کی صلاح ہے

نقاب پوش - میرے خیال میں اسکو عرب کی سیر کرانا چاہیئے - وہاں جاکر رسول اللہ کی درگاہ پر اپنے گناہوں سے توبہ کریں - اور وہیں بود و باش اختیار کریں - ٹھیک ہے - کہ نہیں -

جوان - صلاح تو معقول ہے - مگر عبدالستار سے تو بدلہ نہ لیا گیا -

نقاب پوش - ارے یار واللہ کیسے کور عقل ہو کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ستار عاشق صادق ہے - اپنی یہ حسین معشوقہ کے غائب ہونے کی خبر سنکر ضرور اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیگا - ہاں تمہیں اب سونا چاہیئے -

نوجوان - میرے خیال میں آپ جاکر سوتے اور میں اس کی حفاظت کرتا ہوں - کیونکہ آپ تھک گئے ہونگے -

نقاب پوش - نہیں نہیں تم ہی جاکر سوؤ میں نہیں سوؤنگا -

نوجوان نے انکار کی ٹھانی - مگر اس کے زبردست دوست نے سر سے پھر اشارہ کیا - کہ نوجوان کو مجبوراً جانا ہی پڑا اپنے کمرے میں جاکر دھڑ سے پلنگ پر جا بیٹھا - اور اس مسٹری مین (نقاب پوش) کو کوسنے لگا - کہ افسوس یہ اسوقت چلا جاتا - تو

کیا ہی اچھا تھا میں اپنے دل بیقرار کو اس کے وصال سے شاد و بامراد کرتا - اور اس گوہر بے بہا کو جس طرح بھی ہو سکتا منا دنا کر راضی کر لیتا - بھلا راضی کیوں نہ ہوتی - جبکہ اس کی چادر عصمت کو میں نے چاک کر دیا ہوتا - پھر تو خواہ مخواہ مارے شرم کے میرا دامن پکڑتی - مگر افسوس یہ حرامزادہ کسی طرح مانتا نہیں - اغلب ہے کہ یہ کمنہ شریف میں مجھے ہی دے ڈالے - مگر اُف بہت عرصہ کے بعد میں اس پری پیکر پر قبضہ کرونگا - ہائے مجھ سے ذرا بھی نہیں سنبھلا جاتا بھلا اتنا زمانہ کیونکر کاٹوں گا - افسوس اس وقت ایک بوسہ ہی مل جاتا - کہ اتنا عرصہ دراز میں اس بوسے کی چاشنی سے مزا لے لے کر دل پر صبر کرتا - ہاں تو مجھے چلکر دیکھنا چاہئے شاید وہ سو گیا ہو -

اتنا کہکر نوجوان بستر غم سے اٹھا - اور دبے پاؤں پھر اسی کمرے میں گیا - جہاں نازنین بے ہوش پڑی ہوئی تھی - جاکر دیکھا تو وہ ہی نقاب پوش ایک کونے میں سر نیچے کئے خواب غفلت میں کسی قدر مدہوش ہے - اب اندر قدم رکھنا چاہا - مگر پھر خیال گذرا - کہ مبادا یہ جاگ رہا ہو - تو مفت میں شرمندگی اٹھانی پڑے - بہتر ہے کہ اس کو آواز دیکر معلوم کر لوں - کہ آیا جاگتا ہے - یا سوتا ہے - یہ خیال آتے ہی نہائیت ہلکی آواز سے نقاب پوش کو پکارا - مگر جواب نہ آنے سے خوش ہوا - پھر تو پھولا نہ سماتا تھا - آخر دبے پاؤں نازنین کیطرف بڑھا - اور جاکر آہستہ سے اس کے چہرے سے رضائی اٹھائی - اور اس وقت اسکا کامل حسن دیکھکر دل کو پکڑ کر رہ گیا بے اختیار چیخ نکلنے کو تھی - کہ اپنے آپ کو سنبھالا - اور پھر آہستہ آہستہ اپنے منہ کو نیچے کرنا شروع کیا -

جب صرف ایک فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا - اور وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے اس کے لب شیریں کا بوسہ لے - کہ نازنین نے حرکت کی - اور نہائیت ہی پھرتی سے اپنے نازک بندھے ہوئے ہاتھوں کو بلند کیا - اور اس جوان کے منہ پر پوری قوت سے مارا - کہ بے ایمان جوان تاب نہ لاکر زمین پر جا پڑا - اور نازنین بدستور سابق

بے ہوش بن گئی۔

اِدہر وہ جوان حوصلہ کرکے اُٹھا۔ مگر ایک آنکھ کے آگے اندہیرا آگیا۔ ہرچند کوشش کی۔ کہ دونوں آنکھوں سے دیکھے۔ مگر داہنی آنکھ سے بالکل دکھائی نہ دیا۔ اور درد نے بھی زور پکڑا۔ چوٹ گرم تھی۔ جب ہوا لگی۔ تو درد سے تلملانے لگا۔ ناظرین اس جوان کی داہنی آنکھ بالکل پھوٹ گئی تھی۔ کیونکہ ہماری حسن افروز کا پورا ہاتھ اس کی آنکھ پر پڑا تھا۔

(راوی) شاباش اے حسن افروز شاباش۔ خوب کیا۔ بے شک اپنی عفت وعصمت پر قربان ہوجانا چاہیئے۔ اور تباہ کنندہ کو اس سے بھی زیادہ سزا دینی لازمی ہے۔

خیر وہ نوجوان گرتا پڑتا ہائے وائے کرتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اُدھر ہائے وائے کی آواز نقاب پوش نے سُنی۔ اور جھٹ ہوشیار ہوا۔ اور پہلے نازنین کے پاس آکر دیکھا۔ کہ وہ بدستور بے ہوش پڑی ہے۔ اور پھر اس کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ جہاں اُسکا ساتھی شدت درد سے تڑپ رہا تھا۔

اُدہر نازنین زہرہ جبین پھر ہوشیار ہوئی۔ اور نہایت تیزی سے اپنے آپ کو بندوں سے آزاد کیا۔ اور ہر چہار سو نظر کی۔ آخر ایک کونے میں ایک بہت موٹا ڈنڈا پڑا ہوا دکھائی دیا۔ چپکے سے اُٹھا کر اُسکو اپنے قبضے میں کیا۔ اور دبے پاؤں نقاب پوش کیطرف بڑھی۔ اور جاتے ہی دھڑ سے اُس کے سر پر مارا۔ کہ وہ اوندھے منہ گر کر بیہوش ہوگیا۔

پھر اُسی رضائی کو اپنے اوپر اوڑھا اور دبے پاؤں اُس جوان کے کمرے میں گھسی۔ وہ تو آنکھوں پر ہاتھ رکھے رو رہا تھا مطلق خبر نہیں ہوئی۔ کہ کوئی اس سے گذر رہا ہے۔

خیر نازنین نے اُس کمرے کو بھی طے کیا۔ جب تیسرے کمرے میں پہنچی۔ تو اُس کو مقفل پایا۔ اب تو بیچاری کے حواس باختہ ہوگئے۔ قریب تھا کہ غش آجاوے۔ کہ اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور ایک ترکیب سوجھی۔ جھٹ دبے پاؤں اس کمرے میں آئی۔

جہاں مسٹری مین بیہوش پڑا تھا۔ اسکی جیبیں ٹٹولنی شروع کیں۔ آخر ایک سخت شے معلوم ہوئی۔ تو اسکو نکالا۔ تو نہائیت خوش ہوئی۔ یہ ایک چابی تھی۔ جو کہ اسی تالے کی تھی۔ جس نے حسن افروز کو دروازہ کھولنے سے معذور رکھا تھا۔ خیر حسن افروز بدستور سابق دبے پاؤں اس دروازے کے پاس پہنچی۔ اور قفل کھولا۔ جب دروازہ کھولکر باہر نکلنے کو تھی۔ ایک شے سے ٹھوکر لگی۔ اور دھڑام سے گر پڑی۔ اور تاق دیوار سے زور سے ٹکرایا۔ یہ آواز اس جوان کے کان میں گیا۔ اور لپکا کہ دیکھے کہیں نقاب پوش اس حسینہ کو تو نہیں لئے جاتا۔ ادہر نازنین نے پھرتی سے دونوں تاق بند کر کے باہر قفل لگا دیا۔ اور چلتی بنی۔ جوان بہت چلایا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر بے سود ثابت ہوا۔ اور مسٹری مین کو کوسنے لگا کہ اس نے اس سے دھوکہ کیا۔

ادہر بیچاری ستم رسیدہ حسن افروز بازار کو چلتی بنی۔ جب بازار میں پہنچی۔ تو یہ فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ کس طرف جاؤں معلوم نہیں کہ گھر کس طرف ہے۔

اسی اثنا میں کچھ آدمی آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے آتے دکھائی دیئے بیچاری سخت گھبرائی کہ کہیں مذاق نہ شروع کریں۔ یہ سوچکر ایک طرف ہٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد تین شخص وہاں پہنچے۔ تو ایک نے کہا۔

ایک بھئی بمبئی پارسی الگزینڈرا تھئیٹریکل کمپنی نے کمال کر دی ہے۔ کیسے عمدہ سین تھے۔

دوسرا۔ ڈرامہ بھی تو کمال کا تھا۔ "غیبی تلوار"......

تیسرا۔ بھئی نواز مجھے تو خاک لطف نہیں آیا۔ مجھے تو دم بدم میری محبوبہ حسن افروز یاد آتی ہے۔

جب حسن افروز نے اپنا نام سنا۔ تو شبہ یقین سے بدل گیا کہ ہو نہ ہو یہ اسی کا محبوب یاد دلدا ہے۔ اب وہ شخص کچھ آگے نکل گئے تو حسن افروز بھی

اُن کے پیچھے روانہ ہوئی۔ کہ خیر یہ اسی کے گھر کے نیچے سے گذریں گے۔ ناظرین اب اس زہرہ جبین کا گھر پہنچنا کوئی مشکل نہ تھا پھر ایک بولا۔

احمد نواز۔ واہ واہ بھلا آپ کو کیوں لُطف آتا۔ آپ تو بس ہر وقت اپنی محبوبہ کو ہی یاد کرتے رہتے ہیں۔

فخر الدین۔ بیشک یہ تو آج کل عشق میں بہت بُری طرح مبتلا ہیں۔ مگر ہاں اس لفافے کا حال معلوم ہوا۔ کہ کون لیگیا۔

احمد نواز۔ دوست کچھ معلوم نہیں۔ کہ وہ حرامزادہ کون ہے۔ حسن افروز میری بیوی کو دھوکہ باز کہے گی۔ کہ اس نے حسن افروز کو دم دیکر خط لکھنے پر مجبور کیا۔

جب یہ بات حسن افروز کے کان میں پہنچی۔ تو رہے سہے حواس باختہ ہو گئے۔ مگر موقع نہائیت نازک تھا۔ اسلئے تحمل کیا۔

عبد الستار۔ بھائی نواز۔ مجھے غم ہے تو یہی ہے کہ حسن افروز کی بدنامی نہ ہو۔ آہ میرا حال ابتر معلوم ہوتا ہے۔ آہ میری حسن افروز کیا کہوں۔ کہ میں کس قدر بد نصیب ہوں۔ آہ تیرے عبد الستار کو تیرے پیارے ہاتھوں کی لکھی تحریر بھی نہ مل سکی۔ ظالم راستے ہی سے اُڑا لے گیا۔

اتنے میں حسن افروز کا کوچہ آگیا۔ اور یہ کہتی ہوئی کوچے میں گھس گئی۔ کچھ پرواہ نہیں۔ ظالموں کو ظلم کا نتیجہ ضرور ملے گا۔

عبد الستار نے جب یہ آواز سنی۔ تو بہت متحیر ہوا۔ کہ آیا یہ آواز کس کی تھی۔ ہر چند تجسسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر نہ پتہ لگا۔ آخر اپنے راہ لگے۔

خدا کی قدرت کاملہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ جس وقت ہماری ہیروئن حسن افروز اپنے مکان پر پہنچی۔ تو کسی کی آہٹ کو سنا۔ کہ کوئی زینہ سے اُتر رہا ہے۔ جھٹ پٹ ایک طرف ہو گئی۔

اتنے میں دروازہ کھلا۔ اور اُن کا نوکر چھنو ہاتھ میں لائیٹین لئے ہوئے باہر نکلا اور بعد میں اس کے والد بزرگوار یا اللہ کہتے ہوئے برآمد ہوئے۔ اور سیدھے

مسجد کیطرف روانہ ہوئے۔ کیونکہ اذان مدت سے ہو چکی ہے۔ اور صبح کی پو بھی پھٹ رہی ہے۔

اب ہماری ہیروئن کا کوٹھے پر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ کیونکہ دروازہ تو کھل چکا تھا۔ جھٹ پٹ اوپر چڑھ گئی۔ اور چھپتے چھپاتے اپنے کمرے میں جا پہنچی۔ خدا کا صد ہزار شکر ادا کیا۔ کہ خدا نے بطفیل حبیب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیریت سے باعصمت پونچا دیا۔ پھر وہ وقت یاد آیا۔ تو تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے جھٹ اس کھڑکی کو بند کیا۔ جوکہ رات کو بھولے سے کھلی رہ گئی تھی۔ اور حسن افروز کے رنج کی باعث ہوئی۔

ابھی یہ اچھی طرح سے اپنا آپ سنبھال نہ چکی تھی۔ کہ ماما بسم اللہ اوپر آئی۔ اور کہنے لگی۔

ماما۔ حضور آپ کے ابا جان نماز ادا کرنے چلے گئے ہیں۔ آپ کی امی جان یاد فرماتے ہیں۔ کہ آؤ نماز ادا کرو۔

حسن افروز۔ ماما میرا امی جان سے سلام کہدو۔ کہ حاضر خدمت ہوتی ہوں۔

ماما تو اتنا سنکر چلدی اور ہماری ہیروئن نے خدا کا لاکھ لاکھ شکریہ ادا کیا اور کپڑے اتار کر نماز کے لئے روانہ ہوئی۔ اور دونوں نے اکٹھی نماز ادا کی۔

شالا مار باغ کی سیر

ماہ مارچ کا آغاز ہے۔ موسم خزاں کا موسم گذر چکا ہے۔ بہار کا موسم شروع ہے۔ ہر نئی کونپل نیا لباس پہن رہی ہے۔ ہر باغ و گلستان سے پھولوں کی چمک دماغ کو معطر کر رہی ہے۔ وہ درخت جو باد خزاں کے تیز و تند جھونکوں سے مرجھا گئے تھے۔ اب از سر نو سر سبز و شاداب ہونے شروع ہو گئے ہیں۔

اب ہمارے ہیرو و ہیروین کا موسم خزاں بھی عنقریب گذرنے والا ہے اور

وصال عنقریب دلوں میں جوش مسرت پیدا کریگا۔

اس وقت شالامار باغ میں عجب بہار ہے۔ تمام باغ پھول سے پُر ہے اور جا بجا الگ الگ خوشبوئیں دماغوں کو معطر کر رہی ہیں۔ تمام فوارے چھٹے ہوئے ہیں۔ جو کہ ایک نہائت ہی عمدہ اور خوشنما سین پیدا کر رہے ہیں۔ گویا کہ اس وقت شالامار کا ہر ایک تختہ فردوس بریں بن رہا ہے۔

عین اس وقت ایک موٹر شالا مار باغ کے دروازے پر آن موجود ہوئی۔ ان میں سے چند عورتیں جو سفید برقے اوڑھے تھیں۔ نکلیں۔ اور پاؤں میں گئے اونچی ایڑیوں والیاں گرگابیاں تھیں۔ جو سنگ مرمر پر نہائت ہی خوش وضعی سے رکھی جاتی تھیں۔

ان عورتوں میں سے ایک عورت جو کہ سرو قد ہے۔ نہائت ہی نزاکت و ملاحت سے قدم رکھتی ہے۔ خدا جانے کہ کس کا انتظار ہے۔ کہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔ اور بعض دفعہ تو سب سے پیچھے ہی رہ جاتی ہے۔ مگر اس کی ایک سہیلی بار بار ساتھ چلنے کو مجبور کرتی ہے۔ آخر اس سہیلی سے نہ رہا گیا۔ اور کہا۔

سہیلی۔ پیاری افروز خدا کے لئے پیچھے نہ رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری امی جان دیکھ لیں۔ انسان کو چاہیے۔ کہ جہاں تک ہو سکے۔ عقل سے کام لے تمہیں یہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا واجب نہیں۔

حسن افروز۔ صفیہ چل تو رہی ہوں۔ اور کیسے چلوں۔

صفیہ خانم۔ وہ دیکھو تمہاری امی تمہیں پکار رہی ہیں۔

حسن افروز۔ (امی سے) امی جان آتی ہوں۔ (صفیہ خانم سے) ہاں بہن تم تو کہتی تھیں۔ کہ وہ ضرور آئیں گے۔ مگر دیکھو نا وہ تو ابھی تک نہیں آئے۔

صفیہ خانم۔ پیاری اب عنقریب آیا ہی چاہتے ہیں۔ ابھی ہمیں کون سی دیر ہوئی ہے۔

اتنا کہتے ہوئے صفیہ خانم نے جلدی جلدی قدم اٹھائے۔ کہ جس سے

حسن افروز کو بھی تیزی سے چلنا پڑا۔ اور بارہ دری میں فواروں کے دلکش نظاروں سے دل خوش کرنے لگی۔ مگر ہر آبلہ پر حسن افروز سینہ پر ہاتھ رکھکر کہتی آہ یہ ہی حالت میرے سینے سے کی ہے۔ جو چھالوں سے چھلنی ہے ہے

حباب اُٹھے جو مینہ برسا دکھایا میں نے لوگوں کو
یہی حالت ہے اے یارو میرے سینے کے چھالوں کی

تھوڑی دیر بعد شرقی دروازے سے دو نوجوان آتے ہوئے دکھائی دیئے جنکو حسن افروز کی تیز نظروں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ ناظرین یہ کون ہیں غالباً حسن افروز کی نظروں سے آپ نے بھی ضرور پہچان لیا ہوگا۔ یہ وہی ہمارے ناول کے فسٹ اور سکنڈ (پہلا اور دوسرا) ہیروز ہیں۔

اب اس وقت کی حالت کوئی حسن افروز کے دل سے پوچھے۔ کہ کیا حالت ہے۔ بار بار اپنے سفید بُرقے سے اپنے دلدادہ کو تاک جھانک کر رہی ہے وہ کیوں اس لئے کہ آج مدت مدید کے بعد اُسے اپنا محبوب یا عاشق کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

جب صفیہ نے دیکھا۔ کہ حسن افروز شربت دیدار سے مخمور ہوا چاہتی ہے ایسا نہ ہو۔ کہ کہیں کچھ اور کر بیٹھے۔ تو کہا بہن خدا کے لئے اتنی محو تماشا نہ ہو۔ دیکھو تو آج تمہاری ممانی کس طرح گھور گھور کر دیکھ رہی ہیں۔

حسن افروز۔ اس کی واللہ مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ اے صفیہ خدا کے لئے مجھے دل بھر کر اپنے محبوب کی شکل دیکھ لینے دے۔ تمہاری تمام عمر احسان مند رہونگی۔

صفیہ خانم۔ افروز۔ افروز سنبھل۔ نادان نہ بن۔ کیا تو اپنی بدنامی کیا چاہتی ہے۔ ہوش کر ہوش کر نہیں تو ابھی ماما کو بھیج کر واپس کر دوں گی۔

حسن افروز۔ اُف میری صفیہ خدا کے لئے ایسا نہ کرنا (آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں) اپنی غلام افروز پر یہ ستم نہ ڈھانا۔ لو میں وہی کرنے کو تیار ہوں۔ جو تم کہو گی۔

صفیہ خانم (دلاسا دیکر) غم نکریں۔ تیرے فائدے کو کہتی ہوں۔ وہ دیکھو تمہاری امی تالاب پر بھی پہنچ گئی ہیں۔ چلو ہم بھی چلیں۔

یہ کہکر صفیہ نے حسن افروز کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور حسن افروز نے ایک آخری نظر دلدار پر ڈالی۔ کہ گویا اسکو وداع کر رہی ہے۔ چند ہی لمحوں میں یہ سہیلیاں آبشار کے پاس پہنچ گئیں۔ اسکے نظارے سے دل بہلا کر تالاب کے گرد چکر لگانے لگیں پھر حسن افروز اپنی والدہ کے ساتھ ساتھ صفیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے اس بارہ دری کو روانہ ہوئی۔ جو کچھ دریدہ اور کہنہ معلوم ہوتی ہے۔

ادہر ستار و نواز بھی گھومتے گھامتے اس بارہ دری کے پاس آئے۔ اور تالاب و آبشار کا نظارہ نظر انداز کرنے لگے۔ کہ اچانک ایک لفافے پر احمد نواز کی نظر پڑی۔ جو کہ آبشار کے پانی میں غوطے کھا رہا تھا۔

نواز بھاگ کر نیچے گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آیا۔ اس وقت اس کا چہرہ مارے خوشی کے کندن سا سُرخ ہو گیا۔ پھر آتے ہی کہنے لگا۔

احمد نواز ۔ ستار ستار دیکھو دیکھو۔ یہ وہی لفافہ معلوم ہوتا ہے۔ جو کہ اس رات میرے ہاتھ سے وہ مسٹری مین چھین کر لے گیا تھا۔

عبد الستار ۔ نہیں نہیں تم بھولتے ہو۔ غور کرو کہ وہ لفافہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔

احمد نواز ۔ اغلب ہے۔ کہ ان ہی عورتوں میں سے کوئی عورت لائی ہو۔ ہاں اسکو کھول کر پڑھنا چاہئے۔ یقیناً یہ لفافہ تمہاری محبوبہ دلنواز کا ہے۔ لو تم اپنے ہی ہاتھ سے کھولو۔

ستار نے وہ لفافہ لیکر کھولا۔ خط کے نیچے دیکھا۔ واقعی حسن افروز کا نام لکھا تھا۔ قریب تھا۔ کہ شادی مرگ ہو جاوے۔ کہ احمد نواز کی لگاتار کوشش نے ایسا ہونے سے باز رکھا۔ ستار کبھی اس نام کو بوسے دیتا۔ کبھی خط کو آنکھوں پر رکھتا۔ چھاتی سے لگاتا۔ اور اس کی تحریر پر قربان جاؤں قربان جاؤں کہتا۔

خیر احمد نواز نے دلاسا دیا اور کہا۔

احمد نواز۔ بھئی ستار خدا کی قدرت کاملہ ملاحظہ کرو۔ کہ جس طرح اچانک میرے ہاتھ سے گم ہوگیا تھا۔ اب پھر اسی طرح اچانک پڑا مل گیا ہے۔ بھائی ستار انہی باتوں سے تو خدا کی خدائی ظاہر ہوتی ہے۔

عبدالستار۔ بیشک بیشک۔ میرے ناقص خیال کے مطابق تو خدا کے حکم سے کوئی فرشتہ اس حرامی نقاب پوش سے چھین کر پھینک گیا ہے۔

احمد نواز۔ اس میں تو بالکل شک نہیں۔ واقعی یہ انسان کا کام نہیں۔ فرشتے کا ہے۔ بھائی چاہے وہ آدمی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ہم تو ضرور اُسے فرشتہ ہی کہیں گے

عبدالستار۔ تو واقعی تمہارے خیال کے مطابق ان عورتوں میں سے کوئی عورت لائی ہوگی۔ مگر دوست وہ ضرور حسن افروز کی والدہ کو دکھانا چاہتی ہوگی اچانک اس کے ہاتھ سے گر گیا ہوگا۔ کیوں نہ گرتا۔ جبکہ ہم پاکباز عاشق و معشوق کی بے لوث محبت میں خلل ڈالنا چاہتی ہوگی۔

احمد نواز۔ خبر نہیں اس نے حسن افروز کی والدہ کو دیا ہے یا نہیں۔

عبدالستار۔ نہیں دیا ہوگا۔ اگر دیا ہوتا تو یقیناً تمہاری بیوی تمہیں اس واقعہ کی اطلاع دیتی۔ (انگلی سے ایکطرف اشارہ کر کے) نواز وہ دیکھو تمہاری ماما ادہر آرہی ہے۔ کیا آپ کی ماما بھی یہاں موجود ہے۔

احمد نواز۔ ہاں میری امی جان نے تمہاری بھاوجہ کے ساتھ کر دیا تھا۔ تاکہ اسکو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

اتنے میں ماما آئی اور کاغذ کا پرزہ دیتے ہی واپس لوٹ گئی۔ دونوں دوستوں نے پڑھا۔ تو یہ لکھا پایا۔

اب آپ مع عبدالستار کے تشریف لے جاویں۔ کہ حسن افروز بہت تنگ ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بیقراری کچھ اور رنگ لادے اور آج مجھے حسن افروز کی ممانی حسن افروز پر خفا معلوم ہوتی ہے اور بار بار اپنی بھانجی کو محبتوں میں اُڑاتی ہے۔ جس سے ہم دونوں یہاں چلکر

خاک ہوئی جاتی ہیں سینے میں دبا کر چپ ہو رہتی ہیں یہ ہی باعث ہے۔ کہ میں نے یہاں سے چلے جانے کو کہا ہے۔ آگے آپ مالک ہیں۔
(صفیہ)

احمد نواز۔ لو بھائی پڑھ لیا۔ اب ہمیں چلنا ہی چاہیے۔

عبد الستار۔ میں تو نہ جاؤنگا۔ آہ مدت کے بعد معشوقہ کا دیدار فرقت آثار کیا ہے۔ اور تم مجھے محروم رکھنا چاہتے ہو۔ کہ دوبارہ صورت نہ دیکھوں۔

احمد نواز۔ تمہیں میرا کہنا ماننا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کف افسوس ملنا پڑے۔ آخر بھائی میری بیوی نے جو یہ لکھا ہے تو کچھ سوچکر ہی لکھا ہوگا۔

عبد الستار۔ (شکستہ دلی سے) چلو بھائی۔

اتنا کہتے ہی ستار ہزاروں حسرتوں اور امیدوں کو اپنے خانۂ دل میں دباتا ہوا احمد نواز کے ساتھ چلدیا۔ اور اب ادھر کا حال تحریر کیا جاتا ہے۔

بہرور بانو۔ میری بیٹی صفیہ تم ملول کیوں ہو۔ میں قربان جاؤں۔ سیر و تفریح سے دل بھلاؤ۔ مگر دیکھو برقعہ اوڑھے رکھنا۔

حسن افروز۔ (افسردہ دلی سے) بہت بہتر ہے امی جان۔

بہرور بانو۔ (صفیہ خانم سے) جاؤ بیٹی اپنی سہیلی کا دل بہلاؤ۔

صفیہ خانم۔ بہت اچھا خالہ جان۔

اتنا کہتے ہی حسن افروز اور صفیہ تو چلدیں۔ تو مہمانی افروز جسکا نام دل آرا ہے۔ بہرور بانو سے اس طرح گویا ہوئی۔

دل آرا۔ بہن اب تمہاری حسن افروز نہائت ہی پیچیدہ معاملوں میں گرفتار ہے خدا خیر کرے۔ مجھے خدشہ ہے۔ کہ کہیں کوئی نیا گل نہ کھلائے۔

بہرور بانو۔ دل آرا دل آرا یہ تم کیا کہہ رہی ہو بھلا میں بھی تو سنوں۔ کہ وہ ایسے کون سے پیچیدہ معاملے ہیں۔

دل آرا۔ آہ مجھے کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ میری زبان زیب نہیں دیتی

کہ عرض کروں۔

بہرور بانو۔ (زرد ہوکر) اچھا کہو گی بھی یا نہیں۔ یا یونہی بکے جاؤ گی۔

دل آرا۔ کہتی تو نہ مگر نہ کہتے ہوئے بھی نہیں بنتی مجبوراً کہتی ہوں۔ کیونکہ میرا فرض ہے۔ کہ تمہیں ایسے معاملوں سے آگاہ کروں یعنی کہ تمہاری حسن افروز کا چال چلن حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔ صفیہ کے ذریعے سے ایک شخص سے خط و کتابت ہوتی ہے جسکا ثبوت اس وقت میرے پاس موجود ہے۔

بہرور بانو۔ اری دل آرا کیا تو دیوانی ہوگئی۔ کہ ایسے واہیات کلمے بک رہی ہے۔ شرم کر شرم کر میری حسن افروز پر یہ طعنے۔۔۔۔

دل آرا۔ تمہیں کیا معلوم۔ کہ آج سے کچھ یوم پیشتر ایک شخص حسن افروز کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ مگر حیران ہوں کہ واپس کس طریقے سے آئی۔ پھنسی تو ایسی سخت مصیبت میں تھی۔ کہ جہاں سے نکلنا دشوار تھا۔ مگر میں خود حیران ہوں۔ کہ باوجود اس طرح مصیبت میں گرفتار ہونے کے گھر میں کیسے آگئی۔

بہرور بانو۔ دل آرا زبان سنبھال اور گریبان میں منہ ڈال اور دیکھ کہ کیا کہہ رہی ہو۔ نادان کیا تمہاری اور میری لڑکی دو ہیں۔

دل آرا۔ میں نے بہت گریبان میں منہ ڈالا۔ مگر سوائے بے چینی کے جو حسن افروز کے سبب سے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں خدا جانے کب سے درگذر کر رہی تھی۔ مگر آخر اس معاملے کو طول پکڑتے دیکھکر میں نے طوعاً و کرہاً تمام حال بتا دیا۔ اگر کہو تو اسوقت وہ خط جو حسن افروز نے صفیہ کے ذریعے سے اپنے آشنا کو بھیجا تھا۔ دکھا دوں۔

بہرور بانو۔ (غصے سے ترشرو ہوکر) لاؤ میں بھی تو دیکھوں۔ کہ وہ کونسا خط ہے قسم ہے خدا کی تجھے اس جھوٹ جو تم نے میری جوان کنواری کنیا (دانہ یاقوت جسکا ننگ و ناموس مثل آئینہ صاف و شفاف ہے) پر لگائے کا مزا چکھا دونگی لا اب دیتی ہو یا بس کیا جیبوں کو گھر میں بھول آئی ہو۔

دل آرا نے ہرچند تلاش کیا۔ مگر لفافے کا کہیں نام و نشان نہ پایا۔ رہے سہے

حواس باختہ ہو گئے۔ اور بہت افسوس کیا کہ میں نے کیوں یہ بات اپنی نند بہرور بانو پر ظاہر کی۔ افسوس ثبوت جاتا رہا۔ بدنامی آئی۔ (بہرور بانو سے)۔

دل آرا۔ قسم خدا کی کہیں گھر رہ گیا ہے۔ واللہ میرے پاس موجود تھا۔ میں خاص تمہارے ہی دکھلانے کے لئے لائی تھی۔

بہرور بانو۔ دل آرا تو کبھی پھل نہ پا دے گی۔ جو کہ تم نے اس کی سگی بھاوج اور ساس ہو کر ایسا بہتان اٹھایا ہے۔ تو یہ ہے بس سمجھ لو کہ اب تمہارا اور ہمارا تمام عمر کا ساتھ چھوٹا۔ قسم ہے دل تو یہ چاہتا ہے۔ کہ تم کو قتل کر کے خود بھی مرجاؤں۔ مگر خیر پرواہ نہیں اسکا بدلہ ضرور لونگی ضرور لوں گی؟ (ماما سے) اری او ماما ادھر آ۔ اور سامان تیار کر کہ میں اب یہاں ایک منٹ بھی توقف نہیں کر سکتی۔

ماما نے جب اپنی مالکہ کے بدلے ہوئے طور دیکھے۔ تو بشرے سے سمجھ گئی۔ کہ آج کچھ ضرور دال میں کالا ہے۔ جھٹ پٹ بیچاری نے اسباب اٹھانا شروع کیا۔ تمام سامان سمیٹ کر سر پر دھر ادھر چل کھڑی ہوئی۔ اور ادھر بہرور بانو نے صفیہ اور حسن افروز کو بھی بلایا۔ جو بیچاری سمجھیں تھیں کہ بس ابھی حشر برپا ہوا چاہتا ہے۔

حسن افروز۔ بہن صفیہ۔ میرا قصور معاف کرو۔ کہ میں اب دنیا میں ایک لمحہ بھی نہیں جی سکتی۔ بس اب تم اپنی حسن افروز کو خیرباد کہہ لو۔ کہ پھر تمہیں یہ صورت دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ آہ صفیہ کیسی بدقسمت ہوں۔ کہ محروم وصال دنیا سے چلی۔ خیر تم کو اگر وقت ملے۔ تو اس سے کہدینا کہ تیری عاشق زار تیری محبت کی اسیر نے جان دیدی کیونکہ مجھے محبت نے از حد اندھا کر دیا ہے۔ جس کے سبب جینا حرام ہو گیا ہے۔ اگر میں زندہ رہتی تو یقیناً یہ معاملہ طشت ازبام ہو جاتا۔ تو پھر میرا جینا سخت محال تھا۔ اسلئے میں نے بہتر سمجھکر اپنی جان معرض خطر میں ڈال کر دے دی ہے۔ مگر صفیہ خدا کے لئے یہ ضرور کہدینا۔ کہ میرے بعد وہ زندہ رہے۔ اور کبھی کبھی میرے پرحسرت مرقد پر فاتحہ پڑھ لیا کرے۔ کہ اسکو ثواب اور میری روح

کو خوشی نصیب ہو۔
اتنا کہا اور زہر کی پڑیا نکالی اور چاہتی تھی کہ پھانک لیوے۔ کہ صفیہ خانم نے ہاتھ پکڑ لیا۔
صفیہ خانم۔ افروز افروز یہ تم کیا بک رہی ہو۔ خدا کے لئے نادان نہ بنو۔ اور یہ کیا کارہ کرنے لگی رہیں تو سمجھتی تھی کہ تم ہنایئت ہی صابر ہو۔ مگر آج عقدہ حل ہوگیا کہ تم بزدل ہو۔ پیاری بہن اس راہ عشق میں بہت مصیبتیں ہیں۔ تمہیں تمام کو ہمت و استقلال سے برداشت کرنا چاہیئے۔
حسن افروز۔ بہن صفیہ تو کیا تم یہ گوارہ کرتی ہو۔ کہ تمہاری حسن افروز ایسی بدنامی سی ہر ایک کے طعنے سہے۔ نہیں نہیں صفیہ حسن افروز کو مرجانا بہتر ہے۔ مگر طعن و تشنیع سننے گوارا نہ کرے گی۔
صفیہ خانم۔ حسن افروز میں تمہیں کبھی بھی ایسی بات نہ کرنے دونگی۔ خیال تو کرو کہ خدا نخواستہ اگر تم نے ایسا فعل بد کر بھی لیا تو کیا بدنامی کا بدنما داغ مٹ سکتا ہے۔ نہیں افروز نہیں۔ بجائے اس کے کہ مٹے وہ روشن ہوگا۔ یہ نہ سمجھو کہ پھر تم بچ جاؤ گی۔ تمام زمانے میں افواہ پھیل جائے گی۔ کہ حسن افروز نے محبت میں جان دی۔ اس پر طرہ یہ کہ تمہاری ممانی کا یہ غصہ سچ ہو جائیگا۔ تمہیں چاہیئے کہ اس کے طعنے کو مٹادو۔ دوسرا اگر تم نے جان دے بھی دی۔ تو کیا عبدالستار زندہ رہیگا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم اس خام خیالی سے باز آؤ۔ لاؤ مجھے یہ پڑیا دیدو۔ (جھٹ پڑیا افروز کے ہاتھ سے چھین لی اور اپنی ایڑی سے گڑھا کھود کر اسمیں دبادی۔
حسن افروز۔ (روتی ہوئی) بہن صفیہ آج ضرور نیا گل کھل چکا ہے۔ افسوس امی جان ضرور مجھ سے متنفر ہونگی۔
صفیہ خانم۔ تو پھر کیا ہوا پیاری بہن۔ تمہیں استقلال سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ رنج کے بعد راحت کا آنا لازمی امر ہے۔ ہراساں نہ ہو۔ بلکہ صابر بن کر ہر ایک مصیبت جھیلنے کے لئے چھاتی تان کر تیار رہو۔ تو جلدی آنسو پونچھو۔

امی یاد کر رہی ہونگی۔

اتنا سنتے ہی حسن افروز نے اپنے گلابی رخساروں پر سے خطا ہوئے آنسو پونچھے جو گلاب پر شبنم کا کام دے رہے تھے۔ اور دونوں سہیلیاں بظاہر خوش چہروں کو بنائے ہوئے روانہ ہوئیں۔ تو بہرور بانو نے کہا۔

صفیہ خانم۔ کیوں خالہ جان خیر تو ہے۔ ہمیں کیوں یاد فرمایا۔

بہرور بانو۔ بیٹی گھر کی تیاری کرو کہ میں اب لمحہ بھر یہاں توقف نہیں کر سکتی۔

صفیہ خانم۔ آخر اسکا سبب بھی تو ہوگا۔ ہاں اگر آپ اداسی ہولیں ہیں۔ تو یہ ماننے کے قابل نہیں۔ کیونکہ یہ مقام تو دل کو فرحت طبیعت کو چین دماغ کو تقویت بخشنے والا ہے۔ بھلا ایسی جگہ پر کب طبیعت اوداس ہوتی ہے۔

بہرور بانو۔ بیٹی اچانک حادثوں سے انسان کی طبیعت گلزار میں بھی خراب ہو جاتی ہے۔ سیر و تفریح کا لطف تب تک ہی ہے۔ جب تک کہ دل کو آرام ہو۔

صفیہ خانم۔ آہ خالہ جان! اچانک حادثہ آپ نے کیا فرمایا۔ یہاں اودھر حادثہ عجب رنج دہ بات ہے۔

بہرور بانو۔ اس کا حال پھر کبھی کہوں گی۔

صفیہ خانم۔ خدا کے لئے تھوڑی دیر تو ٹھیریں ابھی تو صرف ایک ہی گھنٹہ گذرا ہے۔

بہرور بانو۔ اچھا تمہاری خاطر میں ٹھہر جاتی ہوں۔ ہاں تو ماما شبراتن کو کہو کہ ماما بسم اللہ کو واپس بلائے۔

ماما سنتے ہی چلدی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ماما کو بلالائی۔ اور حسن افروز و صفیہ خیر کے تختے پر سیر کے لئے روانہ ہوئیں۔ بعد میں صفیہ خانم اور پری تمثال حسن افروز شرقی دروازے کے پاس کے مینار پر چڑھ گئیں۔ اور قدرت خدا کا ملاحظہ کرنے لگیں۔ آتی دفعہ دونوں خاتونوں نے مینار کے ستونوں پر اپنا اپنا نام اور تاریخ کندہ کی۔ جو ہنوز باقی ہے۔ اور ہمارے اس قصے کے سچا

ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔

خیر دو تین گھنٹے متواتر دونوں سہیلیاں سیر کرتی رہیں۔ بعد میں جائے قیام پر روانہ ہوئیں۔ اور وہ پھل وغیرہ جو دسترخوان پر چنے ہوتے کھانے لگیں۔ اور خوب ہی سیر ہو کر کھایا۔ اور واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگیں۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں چل کھڑی ہوئیں۔ اور اپنی موٹر میں بیٹھیں اور روانہ ہوئیں۔

آہ جو خدشہ تھا وہی ہوا

والدہ ستار۔ (اس کے والد سے) کچھ آپ کو ستار کے چال چلن کی خبر ہے واللہ میں تو مدت سے اسکو اداس حیران و پریشان دیکھ رہی ہوں۔ خدا جانے کہ دن بدن کیوں گھٹتا جاتا ہے۔ مجھے تو اپنے فرزند ارجمند کا بہت ہی فکر دامنگیر ہے۔

والد ستار۔ ہاں بیوی میں نے ایکدن اسکو کمرے میں روتے سنا تھا اور کچھ منہ سے بھی کہہ رہا تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ سنوں۔ مگر وہ اسقدر دھیرے سے کہہ رہا تھا۔ کہ میں سن نہ سکا۔ آخر میں اس کے کمرے میں گھس گیا۔ تو اسوقت اسکی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ اور رو رو کے سرخی پکڑ چکی تھیں ہیں بیبی (والدہ ستار) اگر سچ پوچھو تو میرے سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی۔ مگر میں نے نہایت جبر کر کے اپنے کو سنبھالا اور کہا۔

میں۔ کیوں بے ستار تجھے کیا ہوا۔ کیوں بیٹھا روتا ہے۔

عبد الستار۔ جناب آج طبیعت سخت ہی خراب ہے۔

میں۔ آخر کچھ کہو گے بھی یا یونہی عورتوں کیطرح ٹسوے بہایا کرو گے۔

عبد الستار۔ آہا جان ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے میرے جگر میں درد ہے۔

میں۔ اس کا سبب۔

عبد الستار - یہ تو میں نہیں جانتا ہاں البتہ آج سے چند ماہ پیشتر میں ایک دفعہ شاہ پر گیا تھا - اچانک وزنو نے دورہ کیا - نہیں جانتا - کہ آیا یہ دردِ دھوپ کیوجہ سے ہوئی یا کچھ اور وجہ سے -

بس والدہ ستار جب میں نے یہ حال سنا - تو کیا کہوں - کہ میرے دل میں کیسے کیسے خیالات دورہ کرنے لگے - میں اسی حالت میں اپنے دفتر میں آگیا - اور غور کرنا شروع کیا - ہر چند میں نے سوچا کیا - مگر میرے ناقص خیال میں یہ ہی آیا - کہ ہو نہ ہو ستار کسی کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہے مشکل تو یہ ہے - کہ نہ ہی ہم پوچھ سکتے ہیں اور نہ ہی خود وہ اپنی زبانی کہہ سکتا ہے -

جہاں آرا بیگم - اگر ایسا ہی ہوا تو ستار کے دشمنوں کا زندہ رہنا مشکل ہے -

محمد سعید خان - میرے خیال میں ابھی ابھی ایک ترکیب آئی ہے - وہ یہ کہ اسکا تمام حال احمد نواز سے پوچھا چاہیے - کیونکہ وہ ضرور جانتا ہو گا - اور دوسرا وہ ہے بھی برخوردار کبھی نہ جھوٹ کہے گا -

جہاں آرا - تب ہی تو ستار نے رخصت چھ مہینے کی لے رکھی ہے - کہ کام کو جی نہیں چاہتا ہو گا -

محمد سعید - اس میں شک ہی کیا ہے بھئی اگر سچ پوچھو - تو وہ مطلق بے قصور ہے

جہاں آرا - جی ہے تو صحیح - مگر یہ کس مذہب میں لکھا ہے - کہ پرائی بہو بیٹیوں پر نظرِ بد کیجاوے -

محمد سعید - پیاری بیوی یہ معاملے اختیار کے نہیں ہیں - یہ حضرت عشق ہیں - اچانک ظہور میں آتے ہیں -

جہاں آرا - اچھا اب میں تو جاتی ہوں - اور آپ بھی تشریف لے جاویں - بیٹا احمد نواز آنے ہی والا ہو گا -

محمد سعید - ہاں میں جاتا ہوں -

اتنا کہہ کر مسٹر محمد سعید خاں صاحب اپنے دیوانِ خاص میں چلدئے اور

جاتے ہی کچھ کام کرنے کو بیٹھے تھوڑی دیر گذری تھی۔ کہ کسی کے کھٹکھٹا کرنے کی آواز کان میں آئی۔ جھٹ اس طرف متوجہ ہوئے۔ اور دروازہ کی طرف بڑھے۔ اور اُسے آہستہ سے کھولا۔ تو دیکھا کہ احمد نواز بیٹھے مذاق کر رہے ہیں۔ اسی وقت ملازم کو بلایا۔ جو سر جھکا کر دست بستہ آن موجود ہوا۔

خانصاحب۔ جمن جاؤ۔ جس وقت احمد نواز گھر کو جانے لگیں تو انہیں میری طرف بلا لانا۔ بھولنا نہیں۔

جمن۔ بہت بہتر حضور انور۔

خانصاحب۔ جاؤ۔

نوکر جمن تو چلدیا۔ اور خود خانصاحب اپنے کاروبار میں مشغول ہوئے اب دوسری طرف کا حال سنئے ٭

احمد نواز۔ سلو بھائی ایک تازہ خبر سننے میں آئی ہے۔ کہ حسن افروز کی بھائی نے تمام معاملہ طشت از بام کر دیا ہے۔

عبد الستار۔ اسکو کس طرح معلوم تھا (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا)

احمد نواز۔ سنتا ہوں۔ کہ حسن افروز کا ماموں زاد بھائی کہیں سے ایک خط لایا۔ اور اپنی والدہ کو دکھایا۔ جس نے شالامار باغ میں یہ معاملہ چھیڑا مگر کوئی ثبوت نہ ہونے سے جھوٹی ثابت ہوئی۔ کیونکہ وہ خط اس سے کھو چکا تھا جو کہیں بارہ دری میں پڑا ملا تھا۔ سو بھائی شکر کرو۔ کہ خدا نے تمہاری اور حسن افروز کی عزت و آبرو کو بدنامی کی وجہ سے بچا یا۔

عبد الستار۔ یہ بھی خوش قسمتی سمجھو۔ کہ خط اس سے گر گیا۔ ورنہ جینا محال تھا

احمد نواز۔ تمہاری معشوقہ دلنواز تو شالامار باغ میں جان حزیں دینے کو تیار تھی۔ صرف تمہاری زندگی کا خیال کر کے۔ بیچاری اس کام سے باز آئی سچ پوچھو تو اگر یہ معاملہ ایسے ہی رہا۔ تو بیچاری حسن افروز کا دنیا میں قیام کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

عبد الستار۔ سچ ہے۔ مگر دوست کیا کیا جاوے۔

احمد نواز۔ سوچونگا۔ کیونکہ معاملہ ہیچ در پیچ ہے۔
عبدالستار۔ یار خدا کے لئے اسے جلدی طے کرو ورنہ قسم خدا کی زہر کھا مرونگا۔
احمد نواز۔ ایک ترکیب ہے۔ اگر تم خفا نہ ہو۔ اور برداشت کرو تو کہوں۔
عبدالستار۔ وہ کیا ہے؟
احمد نواز۔ وعدہ کرو۔
عبدالستار۔ اچھا بابا وعدہ کرتا ہوں۔ کہ خفگی ظاہر نہ کرونگا۔
احمد نواز۔ تو کسی وقت تمہارے آبا سے ملکر میں تمام حال ایسی حسن وخوبی سے ادا کرونگا۔ کہ تمہارے ابا جان تمہیں اس معاملے میں کچھ نہ کہیں۔ اور خود ہی تمہارا بیاہ رچانے کی کوشش کریں۔
عبدالستار۔ احمد نواز خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ وہ تو مجھے زندہ دیوار میں چن دینگے۔ اگر میری زندگی عزیز ہے۔ تو خدا کے واسطے ایسا نہ کرنا۔
احمد نواز۔ تو پھر سمجھ لو کہ ہر دم فراق جاناں میں کڑھا کروگے۔ اگر تمہارا بیاہ وہ نہ کریں گے۔ تو اور کون کریگا بغیر ان کی رضامندی کے تم کیا کر سکتے ہو۔
عبدالستار۔ کچھ نہیں۔
احمد نواز۔ تو پھر مجھے کیوں ایسا کرنے سے مانع ہو۔ واللہ اسمیں تمہاری بہتری ہے کیونکہ تمہارے والد نہایت ہی دانا ہیں۔ وہ کبھی بھی اس معاملے میں کچھ نہ کہیں گے بلکہ اندر ہی اندر سراغ لگاکر تمہیں منزل مقصود پر پہنچانے کی کوشش کرینگے
عبدالستار۔ خیر بھائی جیسا مناسب سمجھو کرو مگر خدا کے لئے نہایت عمدہ طریقہ سے گفتگو کرنا۔
احمد نواز۔ نہایت ہی اچھی طرح کہونگا۔ مگر ایک بات اور یاد آئی ہے۔
عبدالستار۔ وہ کیا۔
احمد نواز۔ کمرے کے ادہر ادہر دیکھکر (دھیرے سے) تمہاری معشوقہ عنقریب لکھنؤ جانے والی ہے۔

عبدالستار۔ کیوں۔
احمد نواز۔ بطور سیر جاویں گے۔ کیونکہ اس کے آبا کو لکھنؤ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ اکیلا تو نہ جا سکا۔ اب تمام کنبہ سمیت جا رہا ہے۔ اور حسن افروز نے میری بیوی کو بھی ہمراہ جانے کے لیئے اسرار کیا ہے۔ مگر بھئی میں نے تمہاری خاطر اسے اجازت دے دی ہے۔ اور کل اُن کا نوکر چھنو میرے پاس بھی آیا۔ کہ سید صاحب یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت عالی میں حاضر ہوا۔ تو انہوں نے مجھے بھی لکھنؤ جانے کے لیئے مجبور کیا۔ میں نے مان لیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ کہ میرا ایک دوست ہے۔ جس کے بغیر میں نہیں جا سکتا۔ تو فرمایا۔ کہ ہاں بیٹا تم اُنکو بھی ساتھ لے چلو۔ کہ دل بہلے گا۔ سو بھائی اب لکھنؤ کی تیاری کرو۔
عبدالستار۔ مگر ابا جان مجھے ہرگز ہرگز نہ جانیں دینگے۔ اس کا کیا علاج کیا جائے
احمد نواز۔ میں خود اجازت لے دونگا۔ اچھا آداب عرض ہے مقررہ دن سے عنقریب اطلاع دونگا۔
عبدالستار۔ بس دوست تیار ہوئے۔ ہاں آداب عرض ہے۔
مسٹر احمد نواز نے دست و پنجہ لیا۔ اور کمرے سے باہر نکلا۔ اتنے میں جمن سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔
احمد نواز۔ کہو جمن کیسے آئے۔
جمن۔ حضور کی سلامتی ہو۔ آپ کو بڑے میاں یاد فرما رہے ہیں۔
احمد نواز۔ کیا وہ گھر میں موجود ہیں ؟
جمن۔ جناب عالی ہیں۔۔۔۔۔
احمد نواز۔ کہاں تشریف فرما ہیں۔
جمن۔ حضور دیوان خاص میں ہیں۔
اتنا جواب سنتے ہی نواز کا رنگ فق ہو گیا۔ کہ آج ہماری گفتگو ستار کے والد بزرگوار نے ضرور سن پائی ہو گی۔ افسوس ستار کی بے خودی نے مجھے بھی بیخود بنا دیا۔

اچھا اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ ع

تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی

یہ کہتے ہی دیوان خاص میں جا گھسا۔ اور با ادب سر جھکا کر سلام وعلیک کہا۔ جس کے جواب میں وعلیکم السلام ملا۔ اور خانصاحب نے اپنا کاروبار چھوڑ کر کرسی دار کیطرف گھمائی اور احمد نواز کو کرسی پر بیٹھنے کے لیئے کہا۔ تو نواز نے بپاسِ ادب انکار کیا۔ مگر خانصاحب کے اسرار سے بیٹھنا ہی پڑا

خانصاحب۔ بیٹا نواز تمہیں میں نے تکلیف دی ہے۔ معاف رکھنا۔

احمد نواز۔ نہیں جناب بھلا یہ بھی کوئی تکلیف ہے۔ تو بہ نعوذ باللہ۔ میں اور معافی توبہ۔ توبہ۔

خانصاحب۔ یہ تمہارا حسن ظن ہے بیٹا تم کو معلوم ہے۔ کہ میں نے کیوں تمہیں بلایا ہے۔

احمد نواز۔ نہیں جناب میں نہیں جانتا۔

خانصاحب۔ میں ستار کو مدت سے علیل دیکھتا ہوں۔ کیا تم کو معلوم ہے۔ کہ کس بیماری میں وہ مبتلا ہے۔

احمد نواز۔ جی نہیں مجھے تو وہ ہر وقت خوش و خورم معلوم ہوتا ہے۔

خانصاحب۔ نہیں نہیں بیٹا تم چھپاتے ہو صاف صاف کہو۔

احمد نواز۔ بشرطیکہ آپ میرے دوست ستار کو کچھ نہ کہیں۔

خانصاحب۔ اچھا میں تمہاری خاطر عبدالستار کو کچھ نہ کہونگا۔ بلکہ اس معاملے میں جو تم مجھے بتانے لگے ہو۔ ایک حرف بھی زبان پر نہ لاؤنگا۔

احمد نواز۔ تو حضور میرے دوست عبدالستار صاحب ایک دیویئے حسن کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہیں۔

خانصاحب۔ آئیں بیٹا سیدھے لفظوں میں کہو کہ کسی نازنین پر فدا ہو گیا ہے۔

احمد نواز۔ ہاں حضور جیسا سمجھیں۔

خانصاحب۔ آخر کس پر،
احمد نواز۔ یہ پھر کسی وقت خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرونگا۔
خانصاحب۔ نہیں بیٹا ابھی بتا دو۔ کہ اسکو معلوم کرنکے شادی خانہ آبادی کا سامان مہیا کیا جاوے۔
احمد نواز۔ آپ . . . جناب سید حاتم علی شاہ صاحب کو غالباً جانتے ہونگے جو کہ بیرسٹر ایٹ لا ہیں۔
خانصاحب۔ ہاں میں بخوبی جانتا ہوں۔ اور میرے بہت ہی مہربان دوست ہیں۔
احمد نواز۔ بس حضور انہی کی دختر نیک اختر پرستار عبدالستار فدا ہیں۔
خانصاحب۔ آہ ستار خدا تیرا ستیاناس کرے۔ کہ تو میرے ایک عزیز دوست کی دختر پر عاشق ہوا۔
ہائے ستار تو نے مجھے بدنام کرنے کی ٹھانی ہے۔ اچھا خدا تیری حالت درست کرے۔
افسوس کیا معلوم تھا۔ کہ مجھے ایک دوست کے آگے فریادرسی کرنی پڑیگی۔ اگر وہ مان گیا تو فبہا دگرنہ مانا تو تیری خاطر ہمارا خاندان بدنام ہوگا۔
احمد نواز ان کے غصہ آلود چہرہ کو دیکھکر ڈر گیا۔ کہ افسوس میں نے تمام حال سے کیوں آگاہ کر دیا۔ مگر پھر خیال گذرا۔ کہ اگر نہ کہتا تو یہ ضرور دریافت کرنے کے درپے ہوتے۔
احمد نواز۔ آپ اتنا غصہ نہ کریں۔ آپ پیغام بھیجیں۔ امید ہے کہ وہ منظور کریں گے۔
خانصاحب۔ نہیں بیٹا نواز وہ تو اپنے ماموں زاد بھائی کے ساتھ مانگی ہوئی ہے۔ بھلا وہ کب چھڑا کر ہمیں دینگے۔
احمد نواز۔ ہاں جناب بیشک وہ ماموں زاد بھائی کی منگیتر تھی۔ مگر اب نہیں کیونکہ خانگی معاملوں کی وجہ سے سب میں ناچاقی ہوگئی ہے۔ آپ شوق سے جاویں۔

خانصاحب - اچھا میں والدہ ستار سے اس معاملے میں گفتگو کرونگا۔ بعد میں جو رائے قایم ہوگی۔ اسپر عمل کرونگا۔

احمد نواز - بہتر ہے۔ مگر خدا کے لیئے بھائی عبدالستار کو اس معاملہ میں کچھ نہ کہیئے گا۔

خانصاحب - بس بیٹا میں تمہاری خاطر اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرونگا۔ مطمئن رہو۔

احمد نواز - میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر ایک بات اور خدمت مبارک میں کہنا چاہتا ہوں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو عرض کروں۔

خانصاحب - بیٹا شوق سے کہو میں ہمہ تن گوش ہوں۔

احمد نواز - عرض ہے۔ کہ میں چند یوم کے لیئے لکھنؤ چلا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ آپ مسٹر عبدالستار کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دینگے۔ اور اپنے نور نظر کی جدائی مجھ حقیر کی خاطر گوارا فرمائینگے۔ اور آجکل وہ رخصتوں پر بھی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ دفتر سے چھٹی لینی پڑے گی۔

خانصاحب - تمہاری خاطر مجھے یہ بھی منظور ہے۔ اور کچھ کہو میں وہ بھی سننے کو تیار ہوں۔

احمد نواز نے نہایت ہی شکورانہ لہجہ سے سلام کیا۔ اور اجازت کا خواستگار ہوا جس کے جواب میں خانصاحب نے فرمایا۔ ہاں جان پدر جا سکتے ہو۔ میں تمہیں بیٹھنے کو مجبور نہیں کرتا۔ مگر لکھنؤ کب تک جانیکا ارادہ ہے۔

احمد نواز - ٹھیک معلوم تو نہیں البتہ اتوار کو آج سے سات یوم بعد جاوینگے۔

خانصاحب - بہتر ہے۔ تو ستار تیار رہیگا۔

یہ فقرہ سنتے ہی احمد نواز شکریہ ادا کرتا ہوا سیدھا عبدالستار کے کمرے میں گیا۔ اور اسکو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ اور خوش خبری سنائی۔ کہ لکھنؤ کے جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

ادر ادھر خانصاحب والدہ ستار کے پاس آگئے اور یوں کہا۔

خانصاحب۔ لو جی میں تمام حالات برخوردار احمدنواز سے دریافت کر آیا ہوں۔

جہاں آرا۔ کہئے کیا خبر لائے۔

خانصاحب۔ یہی کہ ایک نازنین کی زلف پیچاں میں پھنس گیا ہے۔

جہاں آرا۔ آہ مجھے آگے ہی معلوم تھا۔ کہ اس کا دن بدن مضطر رہنا۔ کسی کی الفت کا ایک ادنےٰ نمونہ ظاہر کرتا تھا۔ آہ جو خدشہ تھا۔ وہی ہوا۔

محمد سعید۔ اب اس رونے دھونے کو چھوڑو اور یہ بتاؤ۔ کہ اب کیا کرنا چاہئے نہیں تو خیال رکھو۔ کہ ایک نہ ایک دن عبدالستار کے دل میں کچھہ اور خیال فاسد پیدا ہو جائیگا۔

جہاں آرا۔ میں کیا بتاؤں۔ میرا تو یہ سن کر جگر پھٹا جاتا ہے۔ واللہ جی چاہتا ہے۔ کہ پیٹ مروں۔

محمد سعید۔ اب صبر کرو۔ صبر کرو۔ جو ہونا تھا سو ہو لیا۔ اب کچھہ عاشق نامراد کا بھی خیال کرنا چاہئے۔

جہاں آرا۔ آپ ۔۔ ستار سے پوچھیں تو سہی کہ کس پر عاشق ہوا ہے۔

محمد سعید۔ کیا فائدہ میں نے تمام حال احمدنواز سے سن لیا ہے۔ اس نے تمام کچا چٹھا من وعن بیان کر دیا ہے۔ پھر کیوں خواہ مخواہ اس سے کسی قسم کا تعرض کریں

جہاں آرا۔ خدا میں بھی سنوں کہ وہ کونسی حور عرش سے اُتری ہے جسنے میرے ستار کا دل لے لیا ہے۔

محمد سعید۔ اجی وہی سید حاتم علی صاحب بیرسٹر کی نور نظر ہے۔

جہاں آرا۔ کیا حسن افروز تو نہیں۔ جی ہے تو بلا کی حسین۔ مگر اسکی وہاں تک کیسے رسائی ہوئی۔ اور حسن افروز کی نسبت تو ماموں زاد بھائی کے ساتھ ہو چکی ہے۔

محمد سعید پہلے تھی۔ مگر اب نہیں۔ کیونکہ خانگی امور نے آپس میں تنازعہ ڈالدیا ہے

جہاں آرا۔ تو کیا آپ کو امید ہے کہ سید حاتم ستار کی نسبت مان لیں گے۔

محمد سعید۔ امید تو نہیں۔ آگے رہی ستار کی قسمت۔
جہاں آرا۔ خیر ہمت ہمارا فرض ہے۔
محمد سعید۔ اچھا میں اب جاتا ہوں۔ اور اسکی نسبت سوچونگا۔
اتنا کہکر خانصاحب پھر دیوان خانے میں چلدئے اور غور کرنے لگے۔

لکھنؤ کی سیر اور انکشاف راز

ناظرین ہم آپ کو آج اس خطہ کی سیر کرانا چاہتے ہیں۔ جو کہ تہذیب و تمدن میں تمام شہروں سے کہیں بڑھ چڑھکر ہے۔ اور تمام ہند سے لیاقت میں سبقت لے گیا ہے۔ یہ وہی شہر ہے۔ کہ جس کے باشندوں میں تکلف کا مادہ قدرت نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے کہ اٹھنا تو تکلف سے۔ بیٹھنا تو تکلف سے غرضیکہ کھانا پینا سونا جاگنا کچھہ بھی ہو مگر تکلف سے ہو۔ یہ وہ شہر ہے۔ جسکو شہنشاہ واجد علی نے زینت بخشی۔ بے تمیزی کا مادہ جو کہ عموماً تھا۔ روکیا اور مادہ تکلف و تمیز رعایا کے دلوں پر مہر کیا۔ جو آجتک وہاں کے باشندے نہایت ہی شان و شوکت سے پورا کر رہے ہیں۔
یہ شہر بھی واقعی قابل دید شہر ہے۔ اچھے اچھے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی قابل دید عمارات دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔
سب سے بڑی عمارت قیصر باغ ہے جس کے چاروں طرف خوش وضع عمارات ہیں۔ جو کہ واجد علی شاہ کی عیش پسندی کا دلچسپ نظارہ پیش کر رہی ہیں۔ اگر اس باغ کی پوری پوری کیفیت درج کیجاوے تو ایک دوسرا ناول تیار ہو جاوے اسلیے اتنے ہی پر اکتفا کر کے دوسری عمارت مچھلی بھون کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہ عمارت اسقدر وسیع ہے۔ کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ واقعی آصف الدولہ نواب نے بنائی تو کربلا تھی۔ مگر آجکل یہ کربلا دلچسپی کا ایک نمونہ ہے۔
دوسری عمارت یعنی امام باڑہ حسن آباد ہے۔ جو کہ خوبصورتی میں لاثانی ہے اور

اس کے ساتھ ہی باہر کی طرف براق کی دو تصویریں ہیں۔ جو کہ دروازے کے اوپر دہر ہونے سے نہائیت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

دروازہ گذر کر اندر کی طرف دو مٹیل کی پریاں کھڑی کر دی ہیں۔ جنکے ہاتھوں میں زنجیریں ہیں۔ گویا کہ وہ ہی اس خوشنما دروازے کو سہارے ہوئے ہیں اور اس عمارت کے چوگرد فصیل ہے۔ جس کے ساتھ ہی چمن بندی کر دی گئی ہے۔

وسط میں ایک تالاب ہے جو دروازے سے کچھ فاصلے سے شروع ہو کر اس عمارت تک چلا گیا ہے۔ جسکا ذکر ابھی ابھی ہم کیا چاہتے ہیں۔ اور اسی تالاب میں ایک کشتی ہے۔ جس پر لکڑی کا ایک گھوڑا کھڑا ہے۔ جو امام حسینؑ علیہ السلام کا لکارا جاتا ہے۔

اس تالاب خوش وضع کے ختم ہوتے ہی وہ خوشنما بلڈنگ ہے۔ جو کہ صفائی۔ عمدگی اور خوشنمائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کی دیواروں پر عربی کی آیات کندہ ہیں اور دروازے بیل بوٹوں سے منقش ہیں۔ اس کے اندر ہزاروں لاکھوں کا سامان ہے۔ جو ایسے قرینے سے رکھا گیا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر ان اشیاء کا ذکر کیا جاوے کہ جو اندر دلچسپی کا نمونہ پیدا کر رہی ہیں۔ تو یقیناً قصہ طول ہو جاوے گا اور ناظرین کی بلا سوو سمع خراشی کا باعث ہو گا۔

خیر اس عمارت کے دیکھنے کو ہمارے پنجابی دوست یعنی ہمارے ناول کے فسٹ ہیرو مسٹر عبد الستار۔ سیکنڈ ہیرو احمد نواز۔ سید حاتم علی شاہ۔ انکی اہلیہ اور دختر نیک اختر یعنے ناول کی ہیروین حسن افروز اور اس کی پیاری سہیلی صفیہ خانم ہیں۔

حسن افروز کا دل باغ باغ ہے کہ وہ متواتر چار یوم سے اپنے پیارے محبوب مرغوب دل کو دیکھ رہی ہے۔ کوئی گھڑی ایسی نہیں کہ زمانۂ وصل سے کم ہو جس کا افروز اب خوش ہے۔ اور ادہر عبد الستار بھی شاد ہے۔ کیونکہ اس کا حال بھی حسن افروز کا سا ہے۔ اب اسوقت امام باڑہ حسین آباد میں سب سیر و تفریح کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارے ہیروین اور ہیرو کی آنکھیں بھی چار ہو جاتی ہیں جسکے سبب سے دونوں کے مسرت آمیز چہروں سے تبسم نمایاں ہو جاتا ہے۔

خیر یہ کربلا میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اور ہر ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ جب اس طرف کی اشیار سے طبیعت سیر ہو گئی تو ساتھ کے کمرے میں گئے۔ کہ جہاں مومی تازیہ رکھا ہے۔

ابھی اُن کو وہاں گئے ہوئے چند ہی منٹ گذرے ہونگے۔ کہ ایک شخص اُسی کربلا میں آیا جو وضع قطع سے پنجابی معلوم ہوتا ہے مگر گفتگو بلا کی ہے سکہ ہو بہو لکھنوی ہی معلوم ہوتا ہے۔

اتنے میں ہمارے دوست مسٹر عبدالستار اس تازیئے کو دیکھکر باہر آئے تو یہ شخص نظر پڑا۔ تو پہچان کر دوڑے اور یہ چلا اُٹھے۔

عبدالستار۔ آہاہ میرے پرانے دوست مسٹر عبدالواحد ہیں۔

عبدالواحد۔ اور آپ میرے پیارے دوست عبدالستار ہیں۔

عبدالستار۔ جی ہاں۔

اتنا کہہ کر دست پنجہ کیا۔ اور گلے ملنے کے لئے آگے بڑھے پہلے تو وہ نووارد گھبرایا مگر اب ضرور تھا۔ کہ گلے ملتا۔ آخر بدقت گلے سے لگا۔ مگر وہ بھی اوچھا سا۔ اور نہایت خفگی سے دانت پیسنے لگا۔

اس کمرے میں ایک قدآدم آئینہ لگا تھا۔ جس کے آگے احمد نواز کھڑا تھا نظاہرا تو اسکی پیٹھ تھی۔ مگر شیشے سے وہ تمام حرکات وسکنات اس نووارد کے دیکھ رہا تھا۔

جس وقت گلے ملنے کے ساتھ ہی عبدالواحد نے منہ چڑھایا تو احمد نواز غصے سے تھرا اُٹھا۔ کہ یہ ظاہرا تو بڑے تپاک سے مل رہا ہے۔ اور باطن میں دشمن ہے۔ اب تو احمد نواز کے دل میں طرح طرح کے شکوک گھر کرنے لگے۔ کہ ضرور یہ کوئی دشمن ہے ہم سے اس پردیس میں بدلا لینا چاہتا ہے۔

ادھر وہ مل کر الگ الگ ہوئے تو عبدالستار نے اس طرح کہا۔

عبدالستار۔ کہئے دوست کب آئے اور کہاں قیام ہے۔

عبدالواحد۔ دوست صبح چھ بجے کی ٹرین سے آرہا ہوں۔ آپ یہاں کب سے قیام

پذیر ہیں۔
عبدالستار۔ ہم کو تو آج چوتھا روز ہے۔ کہ ہم سیر کو آئے ہوئے ہیں۔
عبدالواحد۔ چار روز سے ؟ تب تو یقیناً آپ نے تمام لکھنؤ کی سیر کر لی ہو گی۔
عبدالستار۔ قریباً قریباً مشہور عمارتیں تو دیکھ لی ہیں۔ مگر اب شہر کی سیر باقی ہے اور آپ نے کہاں قیام کیا ہے۔
عبدالواحد۔ قیام تو ابھی کہیں نہیں کیا میری صلاح ہے۔ کہ رات کی ٹرین سے واپس لاہور چلا جاؤں۔
عبدالستار۔ ہیں آج ہی رات ؛ مجھے ہزار افسوس ہے۔ کہ آپ نے صرف ایک ہی دن کے لئے اتنا دور دراز سفر طے کیا اور خواہ مخواہ روپے ضائع کئے ہیں۔ کم از کم تین چار دن تو رہے ہوتے۔
عبدالواحد۔ سچ پوچھئے تو میں شاہجہان پور ایک ضروری کام کے لئے آیا تھا۔ مگر جس کام کے لئے میں نے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔ وہ میرے آنے سے پیشتر ہی سرانجام ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے دل میں خیال کیا۔ کہ لکھنؤ پاس ہے۔ دیکھتا چلوں سو بھائی میرا آنا اس طرح پر ہوا۔ ہاں اگر قیام کی جگہ ہوتی۔ تو یقیناً دو چار دن ٹھیرتا۔
عبدالستار۔ تو بہتر ہے کہ آپ قیام کریں اور ہمارے ساتھ ہی لاہور چلیں۔ آپ کو انشاء اللہ کچھ تکلیف نہ ہو گی۔ کیونکہ ہم نے قیصر باغ میں دو کمرے کرایہ پر لئے ہوئے ہیں ایک زنانہ اور ایک مردانہ ہے۔
عبدالواحد۔ میں آپ کی مہربانی کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ مگر دوست میں تمکو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔
عبدالستار۔ اجی واہ یہ بھی کوئی تکلیف ہے۔ جیسے آپ مسافر ویسے ہم یہاں کو برابر ہیں۔ بلکہ آپ ہمارے ہموطن مہربان دوست ہیں۔ پھر بھلا میں کب روا کرتا ہوں۔ کہ آپ ہمارے یہاں ہوتے ہوئے بغیر لکھنؤ کی سیر کئے روانہ ہو جاویں۔ بھائی آپ شوق سے ہمارے پاس رہیں۔

عبد الواحد۔ بہت بہتر ہے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ مجھ حقیر سراپا تقصیر کی محبت ہنوز آپ کے آئینہ دل میں نقش کالحجر ہے۔

عبد الستار۔ دوست شکریہ پھر ادا کر لیا جاوے گا۔ پہلے آپ کا انٹروڈیوس (تعارف) بھائی احمد نواز سے کرادوں۔ (احمد نواز سے) بھائی احمد نواز یہ دیکھئے میرے ایک دوست مدت کے بعد اچانک مل گئے ہیں آئیے آپ کی بھی انٹروڈیوس کرادوں۔

احمد نواز کا دل نہ چاہتا تھا۔ کہ ایسے شکی آدمی سے ہمکلام ہو۔ مگر ستار کی مجبوری سے طوعاً و کرہاً آگے بڑہے۔ اور مصافحہ کیا۔ ہاتھ کا ملنا تھا۔ کہ عبد الواحد تھر اُٹھا اور لاکھوں پیچیدہ خیالات اس کے دل میں دورہ کرنے لگے۔

پھر سب نے مل کر کربلا کی سیر کی اور پھر باہر آئے۔ حسن افروز وغیرہ تو پہلے ہی ٹانگے میں بیٹھ چکی تھیں۔ اب صرف انتظار تھا تو ان تینوں کا تھا۔ خیر یہ بھی پانچ منٹ بعد آئے۔ اور ٹانگوں میں بیٹھ گئے۔ اور ٹانگے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے دس منٹ میں ہی قیصر باغ کے دروازے پر کھڑے تھے۔ سب ٹانگوں سے اُتر کر اپنے اپنے کمروں کو روانہ ہوئے۔

ماما بسم اللہ نے تمام سامان خورد و نوش کا پہلے ہی بہم پہنچا رکھا تھا۔ اُن کے جاتے ہی دسترخوان پر چن دیا گیا۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

مگر اگر کھانا نہ کھایا تھا۔ تو عبد الواحد نے کیونکہ اس نے اپنے بیمار ہونے کی دلیل پیش کی تھی۔

پندرہ منٹ کے بعد دسترخوان بڑھا دیا گیا۔ تو عبد الواحد سیر کرنے کی اجازت لیکر چلدیا۔ تو احمد نواز نے کہا۔

احمد نواز۔ بھائی عبد الستار یہ کون شخص ہے۔

عبد الستار۔ یہ میرا ایک دوست ہے۔ جو میرے ساتھ مشن ہائی سکول لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔

احمد نواز۔ آپ نے تو میرے روبرو کبھی بھی اسکا ذکر نہیں کیا۔

عبدالستار۔ اجی یہ وہی حاسد دوست ہے جسکا ذکر مسٹر افتخار احمدؐ نے اس جلسے والی رات کیا تھا۔

جب احمد نواز نے یہ فقرہ سنا تو سُن ہوگیا۔ سکتے کا عالم ایسا طاری ہوا۔ کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اور وہ شبہ شک جو اس شخص کی طرف سے اٹھا۔ یقین سے بدل گیا۔

احمدؐ نواز۔ میرے دوست ہوشیاری سے کام لیجیئگا۔ ایسا نہو۔ کہ اس شخص کی دوستی پر اعتماد کرتے ہوئے جان سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

عبدالستار۔ اب دیکھو کیسا شریف ہوگیا ہے۔ اور کیسے تپاک اور گرمجوشی سے برتاؤ کررہا ہے۔ بھئی اب تو یہ کبھی بھی حسد سے کام نہ لیگا۔

نواز یہ سن کر گھبرایا۔ کہ عبدالستار پھر کسی مصیبت میں گرفتار ہوا چاہتا ہے۔ کہ دشمن کو گھر میں لا رکھا ہے۔ خیر پرواہ نہیں جہاں تک ہوسکیگا اس کا وار نہ چلنے دونگا۔

اتنے میں عبدالواحد بھی آن پہنچا اور سب سونے کا سامان کرنے لگے۔ کیونکہ رات کا بہت سا حصہ گذر چکا تھا۔

عبدالستار۔ بھائی عبدالواحد۔ کہئے کہاں کہاں سیر کی۔

عبدالواحد۔ مسٹر معاف رکھنا۔ کہ میں آج ایک گناہ کرکے آیا ہوں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ میں آج ایک رنڈی کے ہاں گیا ہوا تھا۔ آپ میرے دین سے بھی واقف ہیں اور میرے حالات بھی آپکو معلوم ہیں۔ دوسرا بات یہ ہے۔ کہ خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اگر اس طرح نہ خرچ کیا جاوے۔ تو کس طرح کیا جاوے۔ دیکھیے نا پیسہ بھی خرچ ہوگیا۔ اور نفس بھی خوش؟ اور دوسرا ناموری بھی کہ فلاں شخص بہت امیر ہے۔ سینکڑوں روپے منٹ میں خرچ کردیتا ہے۔

عبدالستار۔ آپ نے جو کچھ فرمایا۔ بجا فرمایا۔ مگر بھائی کیا پیسہ خرچ کرنے کا یہی افضل طریقہ ہے۔ اگر آپ کے پاس روپیہ زیادہ ہے۔ تو کہیں مسجد و تالاب کنوئیں

بنوائیں۔ کہ ثواب عظیم ہو۔ روپیہ اچھی جگہ لگے۔ کہ عاقبت بھی سنورے۔ سُنئے استاد ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

عبدالواحد۔ بھئی دوست ستار سچ پوچھو تو لطف کمال کا حاصل ہوتا ہے۔

عبدالستار۔ میں بھی تو سنوں۔ کہ ایسا کون سا لطف ہے جو آپ کو مرغوب ہے

عبدالواحد۔ یہی کہ ہنسی میں موچھیں پکڑ کر دھپ رسید کرنے۔ بس دوست یہ چوچلے ہی انسان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

عبدالستار۔ واہ صاحب واہ خوب کہی۔ لعنت ہے ایسی آشنائی پر جس سے کہ انسان بے آبرو ہو۔

عبدالواحد۔ خیر دوست جو مزاج میں آوے۔ کہئے غلام بیشک تقصیر وار ہے مگر دل کے ہاتھوں مجبور رہے۔

عبدالستار۔ اچھا اب سوئیے۔ کہ رات زیادہ آچکی ہے۔

عبدالواحد۔ بہت بہتر ہے۔

اتنا کہا اور عبدالستار دراز ہوگیا۔ بعد میں عبدالواحد بھی لیٹ گیا۔ قریباً دو گھنٹے تک عبدالواحد کروٹیں بدلا کیا۔ آخر کامل دو گھنٹے کے بعد چپکے سے اُٹھا۔ اور اِدھر اُدھر تجسسانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ جب یقین کامل ہوگیا۔ کہ واقعی ستار سوتا ہے۔ تو احمد نواز کے بستر کی طرف نگاہ کی تو معلوم ہوا۔ کہ وہ بھی سوتا ہے چپ چاپ اُٹھا۔ اور ایک سیاہ لبادہ اپنے زیب تن کیا۔ اور اس الماری کیطرف بڑھا۔ جہاں کہ عبدالستار کا دودھ پڑا رہتا تھا۔ وہاں جا کر جیب سے ایک پُڑیا نکلی جو یقیناً زہر کی تھی۔ اور اس دودھ والے گلاس میں ڈال دی۔ کہ عبدالستار صبح اُٹھیگا۔ اور اسکو پیوے گا۔ اور دنیا سے کوچ کر جاوے گا۔

خیر اس کام سے فراغت پاکر اس دروازے کیطرف بڑھا۔ جو کہ مہ جبین حسن افروز

کے کمرے میں جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُسے کھولا۔ اور دوسری طرف سر نکال کر دیکھا۔ کہ آیا کوئی جاگتا بھی ہے۔ یا نہیں۔ مگر سوائے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کے کوئی جاگتا نہ تھا۔ البتہ چراغ ٹمٹما کر مانع تھا۔ کہ خبردار ادھر ایک رشک قمر سوئی ہے۔ نہ آنا مگر اس بے غیرت شخص نے بیچارے چراغ کا کچھ خیال نہ کرکے دوسرے کمرے میں قدم رکھا۔ اور آہستہ سے پھر دروازہ بند کر دیا۔ جاتے ہی اس وفادار ملازم (چراغ) کو نابود کیا۔ اور حسن افروز کی طرف بڑھا۔ اور رومال نکال کر اس پر تھوڑا کلوروفارم گرایا اور چاہتا تھا۔ کہ حسن افروز کے ناک تک پہنچاوے۔ کہ حسن افروز نے اچانک کروٹ بدلی۔ اور چت لیٹ گئی۔ پہلے تو عبدالواحد ڈرا اور ذرا سا نیچے بھی جھک گیا۔ مگر بعد میں یقین ہو گیا۔ کہ وہ دیوئیے حسن جوانی کی گہری نیند سے مدہوش ہے تو دانت پیستے ہوئے دل میں یہ کہنا شروع کیا۔

اے حسن افروز اب پھر تیار ہو جا۔ کہ تو مصیبت میں گرفتار ہوا چاہتی ہے۔ بے رحم شہزادیٔ حسن مجھے اس دن چھلاوا دیکر چلدی تھی۔ حالانکہ میرا کوئی بدخیال نہ تھا۔ میں بیشک اس دن تیری عفت و عصمت کا پاسبان تھا۔ مگر اب میں ہی تیری چادر عفت و عصمت کو چاک چاک کرونگا۔ اور اب تیار ہو جا۔ کہ تو اس جگہ پہنچے گی۔ کہ قیامت تک والدین تجھے ڈھونڈا کریں گے۔ پھر بھی تیرا نشان نہ پا سکیں گے۔

اتنا کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ اور رومال جس پر کہ کلورافارم گرایا تھا حسن افروز کے ناک تک لے گیا۔ ابھی ناک تک اسکا ہاتھ پونچا نہ تھا۔ کہ کسی کے زبردست ہاتھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسی دم پاکٹ لمپ جیب سے نکالکر عبدالواحد کے چہرے پر روشنی ڈالی اور جھپٹ کر اُسکا برقعہ اتار ڈالا۔ اور بعدہٗ اُسے پہچانکر جھٹ اپنا بھی نقاب اتار ڈالا۔

ناظرین آپ نے پہچانا۔ کہ یہ کون شخص ہے۔ یہ ہمارا اسکینڈ ہیرو احمد نواز ہے جو کہ آج عبدالواحد کی مشکوکانہ نگاہوں سے اس کو تاڑ گیا تھا۔ اور اپنے بستر

تکیئے رکھکر اوپر اس استادی سے چادر اوڑھا دی۔ کہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے کوئی سوتا ہے۔ اور خود ایک خوشنما الماری میں چھپ کر اس کے حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا۔

جب عبدالواحد نے اُٹھکر گلاس میں زہر ڈالا۔ تو بھی احمد نواز نے دیکھا اور پھر جب عبدالواحد دوسرے کمرے میں آگیا۔ تو اپنی جگہ سے نکلکر احمد نواز نے دودھ کو کھڑکی کے ذریعے سے پھینک دیا۔ اور خود عبدالواحد کے پیچھے روانہ ہوا۔ آگے جو کچھ ہوا۔ ناظرین کو معلوم ہے۔

جہاں یہ دونوں شخص کھڑے تھے۔ ان کے پاس ہی ایک کھڑکی تھی۔ جس کے ساتھ ساتھ دور تک گلیری چلی گئی ہے اور احمد نواز کے دائیں ہاتھ ایک دروازہ ہے۔ جس سے کہ ناظرین بخوبی واقف ہیں۔ عبدالواحد نے اچانک اسی دروازے کی طرف نظر کی اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کو اس طرح غور سے دیکھتا ہوا احمد نواز نے بھی اچانک اس طرف نظر کی۔

احمد نواز کا اس طرف سر پھیرنا تھا۔ کہ عبدالواحد نے زور سے ایک لات احمد نواز کے پیٹ پر ماری۔ کہ وہ آہ کہکر منہ کے بل والدہ حسن افروز یعنی بہرور بانو کی چارپائی پر گرا اور خود عبدالواحد چھلانگ مار کر اس کھڑکی سے کودا۔ اور گلیری پر بھاگنا شروع کیا۔ اس وقت گلیری پر اسکے پاؤں کی آواز ٹھپ ٹھپ آرہی تھی۔ تمام کمروں کے لوگ جاگ پڑے اور ہاتھوں میں ڈنڈے لئے ہوئے چور چور پکارتے ہوئے اسکا پیچھا کرنے لگے۔

اس دن ایک نواب صاحب وہاں تشریف فرما تھے۔ اور اُن کے کئی ایک نوکر پہرہ پر تھے۔ چور چور کا آواز سُنکر اس گلیری کیطرف آئے تو دیکھا۔ کہ واقعی ایک شخص بھاگا ہوا چلا آرہا ہے۔

ادہر عبدالواحد نے بھی دیکھا کہ سامنے سے کئی ایک آدمی ہاتھوں میں جبری ڈنڈے پکڑے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ تو پیچھے بھی نگاہ کی۔ اُدہر سے بھی آدمی دوڑتے

ہوئے دکھائی دیئے۔ اب تو رہے سہے حواس باختہ ہو گئے، اور موت کی ہیبت صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں۔

اب دل میں سوچا۔ کہ غضب بُرے کاموں کا نتیجہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ افسوس یہ میرے اعمال ہی مجھے اس مصیبت میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ سچ ہے سچ ہے۔ جیسا بیج بویا جاویگا۔ ویسا ہی کاٹا جاوے گا۔ اگر میں اس مصیبت سے بچ گیا۔ تو توبہ کرونگا۔ ایسے کاموں سے درگذر کرونگا بہتر ہے کہ چھلانگ ماردوں جب نیچے نگاہ کی تو اپنے آپ کو زمین سے بہت اونچا پایا اور خیال گذرا کہ اگر یہاں سے کود پڑا تو زندگی محال ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔

اور کا لفظ کہنے ہی پایا تھا۔ کہ لوگ بالکل قریب پہنچ گئے۔ جھٹ اللہ کا نام لیکر چھلانگ ماردی۔ اور جاتے ہی تمام جسم چکنا چور ہو گیا۔ اور مانند مردوں کے زمین پر بےحس وحرکت ہو گیا۔ وہی لوگ جو اُسکا پیچھا کر رہے تھے نیچے بھاگے گئے اور اس مردہ تن کو اٹھایا۔ کہ جس کا تمام جسم چکنا چور تھا۔ اور ناک سے خون جاری تھا۔ اور آنکھیں چوٹ کے باعث نیلی اور ورم آلود تھیں۔ اُسکو یعنی عبدالواحد کو ہسپتال لے گئے۔

اُدھر جب احمد نواز بہرور بانو پر دھڑم سے جا پڑا۔ تو وہ شور مچاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور نہایت ہی بہادری سے نواز کے سیاہ کوٹ کا کالر خوب زور سے پکڑ لیا۔ احمد نواز نے ہر چند چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر بہرور بانو کا زبردست ہاتھ ذرا بھی نہ کھسکا۔

بہرور بانو کا شور سُن کر سب جاگ پڑے۔ جلدی سے لیمپ کو روشن کیا۔ تو دیکھا کہ احمد نواز سر جھکائے کھڑا ہے جب صفیہ خانم نے اپنے سرتاج کو اس طرح اسیر اور حالتِ چور میں پایا۔ تو کلیجہ دُھک دُھک گیا۔ اور آہ کر کے بیہوش ہو گئی۔

سید حاتم علی صاحب حیران تھے کہ آیا نواز کا اپنا آپ سیاہ لبادے میں چھپا کر آنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ کیا وہ اسقدر بےحیا ہو گیا ہے۔ کہ اُسے کسی

کے پردے کا بھی خیال نہ رہا۔

ادہر یہ شور سُن کر ستار دروازے سے پوچھنے لگا۔ کہ سید صاحب کیا بات ہے۔ مگر آخر جواب نہ پاکر احمد نواز کے بستر کی طرف بڑھا کہ اُسے جگادے۔ دیکھا تو رضائی کے نیچے سرہانے ہیں۔ جو ایسا معلوم ہوتے ہیں۔ کہ کوئی سوتا ہے اور خود احمد نواز ندارد۔ . . . .

اب تو عبدالستار کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ناچار چارپائی پر بیٹھ گیا اور ماتھے پر ہاتھ رکھکر غور کرنے لگا۔ کہ عبدالواحد بھی غایب ہے اور احمد نواز بھی۔ دوسرے اس کمرے میں کیا شور ہے بہت چلایا۔ مگر کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ آخر خاموش ہو گیا۔

اِدہر حسن افروز حیران تھی۔ کہ اس وقت میری سہیلی کا خاوند میرے پیارے محبوب کا سچا رفیق کیوں اس کمرے میں آیا۔ بھلا اس وقت آنے کا کیا کام تھا۔

خیر اسی حیرت میں کامل گھنٹہ گذر گیا۔ اور نواز اسی طرح بیچارہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ آخر سید حاتم علی صاحب نے دلاسا دیکر اس طرح حال معلوم کرنا شروع کیا۔

سید حاتم علی۔ ہاں بیٹا نواز کچھ کہو تو۔ یہاں کس غرض سے آئے۔

نواز خاموش رہتا ہے۔

سید حاتم علی۔ احمد نواز کیوں خاموش ہو۔ خدا کے لئے کچھ تو بولو۔

احمد نواز۔ چچا جان کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ اپنے پاک دامن پر بدنامی کا بدنما داغ لگوانے کے لئے۔

سید حاتم علی۔ آخر کچھ تو کہو بیٹا بدنامی کیسی۔

احمد نواز۔ یہی کہ بھلے کو آیا اور بُرا ہوا۔

سید حاتم علی۔ میری سمجھ میں تمہارے بیہ معمے نہیں آتے۔

احمد نواز۔ میں بتانا نہیں چاہتا۔ اسوقت بحیثیت ایک مجرم ہونے کے قابل سزا ہوں۔ جو سزا میرے لئے تجویز کریں۔ میں خوشی اس کے لئے تیار ہوں۔

سید حاتم علی نہیں نہیں بیٹا۔ نہ کبھی تم ایک ہونہار شریف لڑکے ہو مجھے ہرگز ہرگز تم پر یقین نہیں کہ تم یہاں کسی بدفعل کے لئے آئے ہو گے۔

احمد نواز۔ مگر اب تو مجرم ہوں۔ کہ رات کو چوروں کی طرح کمرے میں آیا۔

سید حاتم علی نہیں میں نہ مانوں گا۔ نہ مانوں گا۔ جبتک کہ مجھے اپنا قصور نہ بتادو گے۔

احمد نواز۔ اگر آپ مجھ حقیر سراپا تقصیر کے حال پر ملال کو سننا ہی چاہتے ہیں۔ تو اپنی مہربانی سے اتنی اجازت دے دیویں۔ کہ صبح سویرے خدمت میں عرض کروں اسوقت شدت درد سے بیتاب ہوں کچھ نہیں سکتا۔

سید حاتم علی۔ بہت بہتر۔ تم جا سکتے ہو۔

احمد نواز بیچارہ آفت کا مارا مارے شرمندگی کے غرق ہوتا جاتا ہے۔ چپکے سے دوسرے کمرے میں چلدیا۔ عبد الستار آگے ہی انتظار کر رہا تھا۔ احمد نواز کو دیکھکر خوش ہو گیا اور پوچھنے لگا۔

عبد الستار۔ کہو بھائی اتنی رات کہاں تھے۔

احمد نواز۔ کچھ نے نہیں تھا بیوقوف تم تے ہی مجھے ایسا رسوا کیا۔ کہ کچھ نہیں سکتا۔ تیری بے عقلی کو میں کہاں تک کوسوں۔ واللہ تم نے مجھے بدنام کیا بدنامی کا داغ میرے پاک دامن پر ایسا لگایا کہ جسکا مٹانا قیامت تک ناممکن ہے۔

عبد الستار۔ (ہاتھ باندھکر) خدا کے لئے مجھے معاف کرو مگر دوست ہوا کیا۔

احمد نواز۔ یہ ہی کہ تم اپنی بے وقوفی سے دشمن کو گھر میں لا رکھا۔

عبد الستار۔ تو کیا آپ کا مطلب عبد الواحد سے ہے۔

احمد نواز۔ ہاں۔

عبد الستار۔ تو خدا کے لئے بتائیے کہ اس نے کیا کیا۔

احمد نواز۔ میں کچھ نہیں کہتا تم ذرا اپنا گلاس دیکھو۔

ستار نے دوڑ کر گلاس کو دیکھا۔ جو کہ زہر کے اثر سے سرخ ہو رہا تھا۔

عبد الستار۔ بھائی ستار میرا دودھ کیا ہوا اور اسکا رنگ کیوں تبدیل ہے۔
احمد نواز۔ سب تمہارے عبد الواحد کی مہربانی ہے۔
عبد الستار۔ تو بھائی اُس نے کیا کیا۔ پھر کچھہ نیا شگوفہ کھلایا۔
احمد نواز۔ شگوفہ بھی وہ کھلایا۔ کہ قیامت تک سرسبز رہیگا۔
عبد الستار۔ اور خود وہ کیا ہوا۔
احمد نواز۔ میں کیا جانوں۔
عبد الستار۔ خدا کے لئے مجھے تمام حال سے آگاہ کرو دیکھو مجھے جنوں ہوا جاتا ہے۔ واللہ اگر نہ کہو گے تو مر جاؤنگا۔

اب احمد نواز نے زیادہ غصہ اور خاموشی رکھنی مناسب نہ سمجھی۔ اسلئے تمام واقعہ من وعن کہہ سنایا۔ ستار نے بہت افسوس کیا۔

ادہر حسن افروز نے صفیہ خانم کو اُٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ جو متواتر آٹھ گھنٹے یعنی دو بجے سے نو بجے صبح تک بیہوش رہی۔

اور سید حاتم علی بھی خود حیران تھا۔ کہ کیا اسرار ہے۔ بہت کوشش کی۔ کہ اسکی تہ کو پہنچیں۔ مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ آخر اکتا کر بیوی صاحبہ سے یوں کہا۔

سید حاتم علی۔ تم کو معلوم ہے۔ کہ نواز کس خیال کے لئے یہاں آیا ہے۔
بہرور بانو۔ مجھے کیا معلوم! مجھے تو تب ہی معلوم ہوا۔ کہ جب وہ میرے اوپر دھڑم سے آپڑا۔
سید حاتم۔ (کچھہ سوچکر) کس طرح آکر پڑا تھا۔ آیا پیٹھ کے بل یا منہ کے۔
بہرور بانو۔ یہ تو میں ضرور کہونگی۔ کہ پیٹھ کے بل گرا۔ کیونکہ وہ جلدی سے اُٹھ نہ سکا۔
سید حاتم علی۔ منہ کے بل گرتا تو شبہ ہوتا۔ کہ شاید کسی خیال کے لئے آیا ہو گا۔ ٹھوکر لگنے سے گر پڑا۔ مگر یہ سمجھہ میں نہیں آتا۔ کہ پیٹھ کے بل کس طرح گرا۔ ایسا ہوتا تو سوائے دھکا دینے کے ناممکن ہے۔
بہرور بانو۔ مگر شاید اسی چور کے پیچھے آیا ہو جسکا ذکر ہو رہا تھا۔

یہ کہتے ہی سید صاحب نے سب کو سونے کی تاکید کر کے خود بھی کروٹیں بدلنے لگے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے صبح کر دی۔ نماز کے لئے اُٹھے۔ وظیفہ کے لئے بیٹھے ہی تھے۔ کہ نوکر چھنو ہچکچاتا ہوا آیا اور کہا۔

چھُنو۔ حضور نیچے دو سپاہی کھڑے ہوئے آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔

سید حاتم علی۔ کیا مجھکو؟

چھُنو۔ جی حضور۔ عالیجناب آپ ہی کو۔

سید حاتم علی۔ چھُنو کہیں بھولتا نہیں۔

چھُنو۔ ہرگز نہیں جناب۔

سید حاتم علی۔ آخر مجھ سے کیا کام۔

چھُنو۔ میں نے ہر چند پوچھا۔ مگر انہوں نے یہی کہا۔ کہ ہم تمکو نہیں بتا سکتے۔ انہی سے کام ہے۔ بس حضور بھر میں آپ کی خدمت عالی میں چلا آیا۔

سید حاتم علی۔ خیر اُنکو کہدو۔ کہ وظائف کر رہے ہیں۔ ابھی حاضر خدمت ہوتے ہیں۔

چھنو بہت اچھا کہکر چلدیا۔ اور سید حاتم علی نے لباس فاخرہ زیب تن کیا اور چھڑی ہاتھ میں لیکر نیچے گئے۔ دیکھا تو واقعی دو پولیس مین کھڑے ہیں۔ سید صاحب نہایت ہی رُعب سے جا کھڑے ہوئے۔ کہ جنکو دیکھکر دونوں پولیس مینوں نے مؤدبانہ سلیوٹ (اسلام) کیا۔ سید صاحب نے بھی اُنکا جواب دیا۔ اور پوچھا۔

سید صاحب۔ کیوں بھئی کیا کام ہے۔

ایک سپاہی۔ جناب عالی تھانیدار صاحب آرزوئے دیدار رکھتے ہیں۔

سید صاحب۔ کیا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

سپاہی۔ جی حضور جناب ہی سے۔

سید صاحب۔ مگر مجھ اجنبی سے کیا کام۔

سپاہی۔ وجہ یہ ہے۔ کہ آج رات کو ایک شخص عبدالواحد نامی پنجابی یہاں سے گر کر چکنا چور ہو گیا ہے۔ اور اب وہ لب جان ہے۔ پولیس نے ہسپتال میں بیانات

لئے ہیں۔ کہ وہ بحیثیت چور کے پکڑا گیا تھا۔ تو اس نے یہی کہا۔ کہ سید حاتم علی نامی پنجابی قیم باغ کے فلاں کمرے میں مقیم ہیں۔ اُنکو اور اُنکے ساتھ دو شریف زادے ہیں اُنکا نام احمد نواز اور عبدالستار ہی میرے پاس بلا لاؤ۔ کہ میں اُن کو آخری وقت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سو جناب عالی یہ واقعہ ہے جو کہ خدمت میں عرض کر دیا ہے۔

سیّد صاحب۔ بہت اچھا میں چلنے کو تیار ہوں۔ (چھنو جاؤ۔ احمد نواز اور عبدالستار کو بلا لاؤ۔ اور کہو کہ لباس پہن کر آویں۔)

چھنو۔ بہت اچھا میرے آقا۔ کہہ کر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں جنٹلمین برآمد ہوئے اور سیّد صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جب تھانے پونچے۔ تو تھانیدار صاحب نے نہائت ہی تپاک اور گرمجوشی سے اُنکا استقبال کیا۔ اور چائے وغیرہ کی خاطر کی بعد میں ایک لینڈو منگوا کر ان تینوں صاحبوں کو بٹھا کر ہسپتال میں پہنچے۔ وہاں اُن کی انتظار کو پہلے ہی تھی سیدھے اُن کو لیکر اس مریض کے کمرے میں پہنچے۔

جب سیّد صاحب احمد نواز۔ عبدالستار نے اس مریض کی طرف نظر کی۔ تو حیران ہوئے اور سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ کہ یہ کل والا مہمان یہاں کیسے آ پڑا۔ مگر نواز اور ستار پر سب حال روشن تھا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا۔ کہ ایسا لب بان کیسے ہو گیا ہے اور نہ ہی یہ سبب معلوم تھا۔ کہ یہ چوٹیں کس سبب سے لگیں۔ خیر عبدالستار نے یوں پوچھا۔

عبدالستار۔ کہو بھائی عبدالواحد آپ پر یہ کیسے گذری یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔

عبدالواحد۔ (نہائت ہی نحیف آواز میں) بھائی ... میں ... اپنے بُرے ... کاموں کا ... نتیجہ بھگت ... رہا ہوں۔

بعد میں ہاتھ سے سب کو کُرسیوں پر بیٹھنے کو کہا۔ جب سب بیٹھ گئے۔ تو اس طرح مسلسل تقریر شروع کی۔

عبدالواحد۔ مسٹر عبدالستار میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ کہ آپ کو میرے ذریعے سے بہت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ آہ میں نے ہی مصیبتوں میں آپ کو اور آپکے

دوست کو پھنسایا۔ اس لئے چند گھڑی کے مہمان کو معافی دو۔

سب اس واردات سے حیران تھے۔ سب پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ کیوں کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ یہ کیسی پیچدار بات ہے۔ صرف عبدالستار و احمد نواز اس بات کو سمجھ رہے تھے۔ سو وہ بھی حیران تھے۔

عبدالستار۔ بھائی میں نے معاف کیا۔ معاف کیا مگر یہ تو بتاؤ کہ تم پر کیا گذری۔

عبدالواحد۔ سب کچھ سنو میرے برے اعمالوں کی بابت سب سنو۔ میں من و عن کہے دیتا ہوں۔ سب سنو۔

تم کو معلوم ہوگا۔ کہ تیس اگست ۱۹۲۲ء کو تم نے ایک رقعہ بدیں مضمون پڑھا تھا۔ کہ منزل عشق بہت ہی کٹھن منزل ہے۔ ذرا سوچ سمجھکر اس میں قدم رکھنا۔ کہ باعث ننگ ہے۔ اگر عشق کا جن سر پر سوار ہے۔ تو مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ کہیے پڑھا تھا یا نہیں۔

عبدالستار۔ (زور سے) ہاں ہاں پڑھا تھا

عبدالواحد۔ وہ رقعہ میں نے ہی تمہاری میز پر رکھا تھا۔ اور اس جلسے والی رات میں ہی تھا جس نے تم کو اور احمد نواز کو یہ کہا کہ ضرور تمہارا بنا بنایا کام بگڑے گا۔ اگر نہ بگڑا تو میں بگاڑ دونگا۔ آہ بھائی اس دن لاہور کے دریائے راوی پر اچانک آکر لڑنے والا میں ہی تھا۔ وہ تمہارا پرائیویٹ خط چھیننے والا بھی میں ہی تھا۔

ان سب سے زیادہ غلطی مجھ سے ایک اور سرزد ہو چکی ہے۔ جو تم کو تمہاری معشوقہ بتادے گی۔ مگر ع

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

وہ خدا کے فضل سے میرے ہاتھوں سے صحیح و سلامت نکل گئی۔ جسکا رشک آج مجھے یہاں تک کھینچ لایا۔ اور اس طرح بے سروسامانی سے مردود سا پڑا ہوں کہ عنقریب میری روح خاکی تن سے آزاد ہو جاویگی۔ (سید حاتم علی صاحب سے) سید صاحب یہ جو میں نے اسقدر گفتگو کر کے آپکا قیمتی وقت ضایع کیا ہے۔ یہ ہم تینوں ہی کے درمیان

ہے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ ہاں آپ کو بھی ایک بات بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ رات کو آپ نے ضرور میرے کرمفرمائے دوست مسٹر احمد نواز کو بحیثیت چور پایا ہوگا۔ صرف اسقدر عرض پرداز ہوں کہ مسٹر احمد نواز مطلق بے قصور ہیں۔ بلکہ وہ آپ سب صاحبوں کی حفاظت کے لئے جان کو جوکھوں میں ڈالکر میرے سامنے آیا۔ اب میں امید کرتا ہوں۔ کہ مسٹر احمد نواز کو خطاوار نہ سمجھیں گے۔ بلکہ وہ قصور یہ غلام ہے۔ جو عنقریب دنیا کو خیرباد کہنے والا ہے۔ مجھے آپ کے کمروں میں سے بھی ایک شخص سے بدلا لینا تھا۔ اِسلئے میں اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے یہاں آیا۔ کہ موقع پردیس میں اچھا لگیگا۔ چنانچہ یہ منصوبہ سوچکر لاہور سے لکھنؤ میں آیا۔ مسٹر عبدالستار سے ملاقات کی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا۔ کہ وہ نہایت پاک دل رحم آشنا ہے۔ جو مجھے دیکھکر خوش ہوگا۔ ہاں اگر خدشہ تھا۔ تو احمد نواز کیطرف سے تھا۔ آخرکار میرا خدشہ درست نکلا۔

خیر میں اُن سے ملا۔ کہ مجھے جائے قیام پر لے آئے۔ مگر مسٹر احمد نواز کی مشکوک نگاہیں البتہ پریشان کرتی تھیں۔ خیر میں نہائیت دلیری کر کے رات کے بارہ بجے آپ کے کمرے میں آیا۔ ابھی اپنا کام شروع نہ کرتے پایا تھا۔ کہ ایک زبردست ہاتھ نے مجھے پکڑ لیا۔ جناب یہ کون تھا۔ یہی مسٹر نواز تھے۔ خیر میں نے دھوکہ دیکر اُن کے پیٹ پر ایسی لات ماری۔ کہ یہ تیورا کھا کر گر پڑے۔ اور میں نے راہ فراری اختیار کی۔ چونکہ میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا۔ اور میرے پاؤں سے ڈھپ ڈھپ کی آواز زور سے آرہی تھی۔ اس لئے تمام لوگوں کو شبہ ہوا۔ کہ میں چور ہوں۔ اور وہ ڈنڈے لیکر دوڑے۔ اب ہر طرف سے لوگ نکلنے شروع ہوئے۔ میں گھبرا گیا۔ اب میرے تمام برے اعمال میرے سامنے مہیب شکلیں بن بن کر دکھائی دینے لگے۔ تب میں نے سوچا۔ کہ چھلانگ مار دوں اگر جیتا بچا۔ تو راہ فراری اختیار کر دوں۔ اور اگر مر گیا۔ تو خیر یہ قید کی ناقابل برداشت مصیبتوں سے تو بچ جاؤنگا۔ چنانچہ میں نے اسی پر عمل کیا۔ اور کود پڑا۔ بعد میں نہیں معلوم کہ یہاں کیسے آیا۔

عبدالستار۔ بھائی تم نے برا کیا۔ کہ کود پڑے۔

عبدالواحد۔ (ہاتھ سے اشارہ چپ رہنے کو کیا) اور پھر بولا سنو آگے سنو۔ آپ سب صاحبان حیران ہونگے۔ کہ میری دشمنی کا کیا سبب ہے۔ جو میں مسٹر عبدالستار کے درپے آزار ہوگیا۔

اس کا آغاز بمقام ڈمڈل (آٹھویں جماعت) مشن ہائی سکول لاہور سے ہے یعنی کہ مسٹر عبدالستار کلاس میں بہت ہوشیار تھا۔ اور میں اس کے مقابلے میں بہت کمزور تھا۔ ایکدفعہ کا ذکر ہے۔ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایک مضمون دیا اور اس پر انعام مقرر کیا۔

صاحبو یہ تو مجھے امید قوی تھی کہ اس انعام کا مستحق عبدالستار ہے۔ مگر دل چونکہ اُن کی طرف سے وقف کدورت ہو رہا تھا۔ نہ چاہتا تھا۔ کہ یہ انعام پا دیں۔ چنانچہ یہ منصوبہ باندھکر میں ایک بی اے کے طالب علم کے پاس گیا۔ اس سے میں نے تمام ذکر کیا۔ اس بندہ خدا نے جیسا میں چاہتا تھا۔ ویسا ہی مضمون بنا دیا۔ اب مجھے کامل یقین تھا۔ کہ انعام میرا ہے۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ خیر جس وقت مضمون کا موقعہ آیا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر نعرہ تحسین کسی نے بلند نہ کیا میں سخت گھبرایا۔ آخر مسٹر عبدالستار نے بھی مضمون پڑھنا شروع کیا۔ مضمون واقعی قابل تعریف تھا۔ اُن کا ہر ہر لفظ گویا کہ دانہ یاقوت تھا۔ کہ دل بے اختیار ہوا جاتا تھا۔

غرضیکہ انہوں نے مضمون سنایا۔ ہیڈ ماسٹر و دیگر ماسٹر صاحبان نے بہت شاباش دی اور وہ انعام مقررہ بھی اُن کے حوالے کیا۔ جو میرے لئے رنج کا باعث ہوا۔ اب چونکہ دم مارنے کی جگہ نہ تھی۔ کیونکہ دماغ قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ مگر صاحبو ایک قسم کا بغض میرے دل میں پیدا ہوگیا۔ اور قسم کھائی۔ کہ ستار کو ضرور رنج پہنچاونگا۔ صاحبو میری بیوقوفی تھی۔ کہ میں نے قسم کھالی۔ آہ آہ اگر میں بیوقوف نہ ہوتا۔ تو آج یوں غریب الوطنی کی موت نہ مرتا۔

خیر تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے مشن ہائی سکول کو خیرباد کہدیا۔ اور اسلامیہ ہائی سکول بخیر انوالہ گیٹ میں جا داخل ہوئے۔ وہاں انہوں نے چند ہی یوم میں اتنی

شہرت حاصل کر لی۔ کہ تمام سکول اُنکو بہ نگاہِ محبت دیکھنے لگا۔

گو یہ سکول چھوڑ بھی گئے۔ مگر میری آتش حسد زیادہ زیادہ مشتعل ہوتی گئی۔ اور اب میں ہر گھڑی ان کے پیچھے رہنے لگا۔ کہ اُن کا خاتمہ ہی کر دوں۔ ہاں اگر یہ کچھ دن اور ہائی سکول میں رہتے۔ تو یقیناً انکو میرے ہاتھ سے ضعف پہنچتا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ میں Ground (گراونڈ) میں کھیلنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ (سید حاتم علی کیطرف مخاطب ہو کر) کہ آپ کے سالے کے لڑکے نصیر الدین سے میری ملاقات ہوئی۔ باتوں نے ایسا طول کھینچا۔ کہ ہم اس دو گھڑی ملاقات میں ایک دوسرے کے خالص دوست بن گئے تھوڑے عرصے میں ہماری خوب دوستی مستحکم ہو گئی۔

ایک دن میں مسٹر نصیر الدین کے ہاں گیا انہوں نے ایک بات کی جو خاص مسٹر عبدالستار سے تعلق رکھتی تھی۔ خیر میں نے اُسی وقت یعنی تئیس اگست ۱۹۲۲ء کو کو نو بجے ایک رقعہ لکھکر اُن کی میز پر رکھا۔ تاکہ یہ باز آجاویں۔ یہ وہی رقعہ ہے۔ جس کا اس سے پہلے ذکر چکا ہوں۔

اسی دن مسٹر نصیر الدین صاحب سعدی سنار کی دکان پر بیٹھے تھے۔ کہ مسٹر عبدالستار تئیس اگست ۱۹۲۲ء کو اپنے گھر سے دفتر کے لئے روانہ ہوئے۔ کہ اثنار راہ میں اُنکی نظر ایک مکان پر پڑی جو کہ خاص اُن کی معشوقہ کا تھا۔ اس مکان کو دیکھکر رو دیئے۔ جس سے نصیر الدین صاحب اُس کے سر ہو گئے۔ کہ اتنے میں میں آگیا۔ تو انہوں نے مجھے کہا۔ پھر میں نے وہ رقعہ لکھا تھا۔

میرے معزز صاحبو آپ مجھ بد نصیب کی جوانی پر کچھ افسوس نہ کریں۔ میں واقعی اس لائق تھا۔ جس کا نتیجہ اب بھگت رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا نہایت ہی اچھا ہوا۔ آہ کبھی مجھے اگر دنیا کی بے ثباتی پر خیال آتا تو ضرور ان بد کاموں سے باز آتا۔ مگر ہائے جوانی کے دن تھے۔ نئی عشق نئے ولولے مگر مجھے کون سی بات تھی جو نہ کرنے دیتے تھے۔

ہاں سید صاحب اگر میرے والد صاحب بزرگوار میری بابت کچھ پوچھیں۔ تو اتنا

ہی عرض کر دیجیگا۔ کہ عبد الواحد نے اپنے کئے کی سزا پالی۔ اور نہائیت ہی حسرت واندوہ سے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

اب وہ رک رک کر چلنے لگا۔ آنکھوں کے ملور بدل گئے مگر نہائیت ہی کوشش سے یہ الفاظ کہے۔

(عبد الستار سے) بھائی مجھے معاف کرنا معاف کرنا کہ میں نے تمکو بہت ہی تکلیف پہنچائی ہے۔

عبد الستار۔ بھائی میں نے تمکو معاف کیا میرا سان نہ ہو۔ تم ضرور زندہ رہوگے۔

عبد الواحد۔ وہ بہت ہی بے وقوف ہے۔ جو ایسی حالت میں اپنی زندگی کی امید رکھے۔ مگر ذرا میری کان میں بات سن لو۔

عبد الستار نے جھٹ کان ادہر کیا۔ تو عبد الواحد نے یہ کہا۔

آپ کی شادی خانہ آبادی جب حسن افروز سے ہو جاوے۔ جو یقیناً تمہاری ہو چکی ہے۔ تو میری طرف سے عرض کر دینا کہ وہ میرے تمام قصور معاف کر دیوے۔ کیونکہ میں نے اسکو بہت رنج پہنچایا ہے۔ میری طرف سے جو جو رنج اس مہ جبین پر پہنچے ہیں ضرور تمکو کہے گی۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو حشر میں میں تمہارا دامنگیر ہونگا۔ بس اداب۔

(نواز سے) بھائی تم بھی میرا قصور معاف کردو۔

احمد نواز۔ بھائی عبد الواحد میں نے معاف کیا۔

عبد الواحد۔ صاحب میں بہت خوش ہوں۔ کہ دنیا سے جاتی دفعہ آپ نے میرے قصور دل سے معاف کر دیئے (سید صاحب سے) ہاں سید صاحب میں آپ کو ایک بات عرض کرتا ہوں۔ کہ آپ ہرگز ہرگز اپنی دختر نیک اختر کی شادی خانہ آبادی نصیر الدین لالچی۔ بدمعاش۔ رنڈی باز سے نہ کریں۔ کہ تمام عمر آپ کی لڑکی سخت مصیبت میں پھنسی رہے گی۔ یہ بات تھی جو بتادی ہے۔ آگے آپ مالک ہیں۔ میں بھی اس کے کہنے اور ذرا ذرا کی بات بتلانے پر اس حالت پر پہنچ گیا ہوں۔ اور لاکھوں بیماریاں اسکو ہیں (جن میں سے ایک سوزاک بھی ہے۔) اگلا لفظ پورا نکلا بھی نہ تھا۔

کہ روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر پرواز کر گئی۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)
سب لوگ اس کی جوانی پر افسوس کرنے لگے۔ اور دریائے اشک بہانے لگے۔
مگر اب ہو ہی کیا سکتا تھا۔ ناچار غم غلط کیا۔ اور اس مسافر کے تجہیز و تکفین کرنے لگے
تھوڑے عرصے کے بعد تمام کام بہم پہنچا دیا گیا۔ اور قبرستان کی طرف روانہ ہوئے۔
وہاں قبر تو تیار ہی تھی۔ اور اس مسافر وطن کو وہیں تاحشر قیامت کی انتظار کے لئے
تنگ و تاریک گھر میں چھوڑ دیا۔ جسکی قبر پر اب تک حسرت ٹپک رہی ہے۔
پولیس نے اور ڈاکٹروں نے تمام بیانات قلمبند کر دیئے۔ اور سید حاتم صاحب
کو اُن کے گھر تک خود تھانیدار صاحب پہنچانے آئے۔ بعد میں تینوں صاحبوں سے
دست و پنجہ کیا۔ اور روانہ ہوئے۔ ناظرین اس طرح عبدالستار کے جانی دشمن کا
خاتمہ ہوا۔
سید صاحب نے گھر میں آکر جو جو سنا تھا۔ بہرور بانو سے کہدیا۔ جسکو سن کر
وہ بھی از حد رنجیدہ ہوئی۔ خاصکر حسن افروز اور صفیہ خانم تو بہت خوش تھیں۔
کہ احمد نواز مطلق بے قصور ثابت ہوا۔
چنانچہ سید صاحب نے اُسی شب رات کے ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے
لکھنؤ کو خیرباد کہا۔ اور دوسرے دن شام کو چھ بجے سہارنپور پہنچے۔ وہاں لاہور
کے لئے گاڑی آگے ہی تیار تھی۔ بس اسمیں بیٹھ گئے۔ اور صبح سات بجے لاہور میں
باخیریت پہنچ گئے۔

شادی خانہ آبادی

آہاہا موسم خزاں گذر چکا ہے۔ ہر چمن و گلشن سے ہوائے خوش مشام جان کو فرحت
بخشنے والی چل رہی ہے جسطرف جائیں دماغ خوشبوئے خوش کن سے معطر ہوا جاتا
ہے۔ عندلیب زار جو موسم خزاں سے از حد ناخوش تھی۔ موسم بہار کی خوشی میں

اپنے آوازۂ خوش سے اُڑا اُڑ کر گویا رقص کر رہی ہے۔

اب ہمارے دوست مسٹر عبدالستار صاحب اور انکی دلربا حسن افروز کا زمانہ فراق گذر چکا ہے۔ اور چند ہی گھنٹوں میں زمانہ وصال دلوں کو جوش مسرت سے بھرنے والا ہے۔ اور مدتوں کے ارمان آج ہی شب نکلنے والے ہیں۔

یہ دن خدا سب کو نصیب کرے۔ جس طرح آج ہمارے دوست مسٹر عبدالستار دولھا بنے مسند پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کے داہنے ہاتھ مسٹر احمد نواز اور بائیں ہاتھ مسٹر فخرالدین بیٹھے ہیں۔ عبدالستار سے چھیڑ خوانی کر رہے ہیں چلئے ذرا ہم بھی اُن کی گفتگو سنیں۔ کہ ضرور پر لطف ہوگی۔

احمد نواز۔ بھائی عبدالستار مبارک ہو۔

فخرالدین۔ میری طرف سے بھی لاکھ لاکھ مبارک ہو۔

عبدالستار۔ خیر مبارک۔ آپ ہی کو مبارک ہے۔

احمد نواز۔ ہمیں پہلے ہی ستار۔ ذرا اپنی اس پہلی حالت سے اس حالت کا مقابلہ تو کرو۔ اُف اُف کسقدر رنج ہوتا ہے۔ واللہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

عبدالستار۔ بے شک۔ مگر خدا کے لئے اب اس منحوس واقعہ کو بالکل بھول جاؤ کہ اس زمانے کے یاد کرنے سے چھاتی پھٹتی ہے۔

احمد نواز۔ بھائی میرے اس زمانے کا یاد دلانے سے اصل مقصد یہ ہے کہ اس قادر مطلق خداوند ذوالجلال لایزال کا شکر یہ ادا کرو۔ کہ تمہیں یہ گھڑی دیکھنی نصیب ہوئی۔ کیا امید تھی۔ کہ تم اس طرح دولھا بنکر اپنی معشوقہ کو لینے کے لئے جاؤ گے ارے بھائی شکر کرو۔ شکر کرو۔ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہو کہ یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ یہ دن کسی کسی کو دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔

عبدالستار۔ بیشک اس کا جسقدر شکریہ ادا کروں تھوڑا ہے کہ وہ پھول جسکا مدت سے خواہاں تھا جس کے گرد گلنے ہی کانٹے نظر آتے تھے۔ یوں اچانک مجھے ملا دیا۔ شکر ہے شکر ہے۔ کہ خدا نے میری منہ مانگی مراد مجھے عنایت

فرمائی۔ خدا سب کے دلوں کے ارمان میری طرح برلادے۔
فخرالدین۔ آمین۔۔۔۔ آمین۔۔۔
احمدنواز۔ دوسری بات یہ ہے۔ کہ اس لفافے کا گم ہو جانا بھئی سچ پوچھو۔ تو مخفی خزانے کی تہ کو پہنچنا تھا۔ یعنی کہ مسٹر عبدالواحد مرحوم و مغفور نے لفافہ اس لئے چھپنا تھا۔ کہ تمہیں تشہیر کرے حسن افروز کی بے آبروئی ہو۔ مگر خدا کے کاموں کا کون شریک ہے۔ اس کو یہ ہی منظور تھا۔ کہ عبدالواحد مرحوم میرے ہاتھ سے لفافہ چھین لے اور وہ حسن افروز کے منگیتر نصیرالدین کو دیوے۔ اور وہ بے وقوف اپنی والدہ کو دے دیوے۔ کہ اپنی مہ جبین منگیتر کی بے آبروئی ہو اور سب سے زیادہ وہ بے وقوف ثابت ہوئی۔ کہ بجائے اس کے کہ اپنی بہو کی چشم پوشی کرتی۔ تمام حالات والدہ افروز سے کہہ سنایا۔ کہ ثبوت کے نہ ہونے سے جھوٹی ثابت ہوئی۔ اگر یہ معاملہ ظہور میں نہ آتا۔ تو کبھی بھی تم اپنی معشوقہ دلنواز کو حاصل نہ کر سکتے۔ کیونکہ حسن افروز تو بے شک اپنے منگیتر نصیرالدین کی ہو چکی تھی۔ بیشک نصیرالدین نے اپنے ایک دوست سے حسن افروز کی بھی بے آبروئی کرائی۔ مگر ستار چاہتا دل سے تھا۔ بیشک جان فدا کرنے کو تیار تھا۔ ہاں اگر عبدالواحد مرحوم مرتی دفعہ سید حاتم علی کو یہ وصیت نہ کر جاتا۔ تو پھر بھی حسن افروز کا آنا ذرا مشکل تھا۔ کیونکہ حسن افروز کے ماموں نے معافی مانگ مانگ کر اپنی ہمشیرہ کو قدرے منا لیا تھا۔ تب سے انہوں نے نہ مانا جب سے کہ عبدالواحد مرحوم نے وصیت کی تھی۔
عبدالستار۔ ہاں ہاں واقعی بہت مشکل تھا۔ عبدالواحد مرحوم کی وصیت نے بیشک سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔
احمدنواز۔ لو بھائی اب سہرا آگیا۔ اب خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔

اب تینوں دوست خاموش ہو گئے۔ تمام کمرہ لوگوں سے پُر تھا۔ اُن ہی لوگوں میں سے ایک سن رسیدہ عابد شخص اُٹھا اور دعائے خیر کہہ کر عبدالستار کے سہرا باندھا۔ کہ سب طرف سے مبارک ہو مبارک ہو سنائی دینے لگا۔ تو ہمارے

تھوڑی دیر و مسٹر فخرالدین صاحب اُٹھے۔ اور سہرا جو کہ ایک نہایت عمدہ چوکھٹے میں جڑا تھا۔ ہاتھ میں لیکر پڑھنا شروع کیا:۔

سہرا

باندھو بنے کے سر پہ یار و شتاب سہرا
نوشہ کا پُر لطافت لایا خطاب سہرا
چھو چھو کے رُخ سے تیرے کھلنے لگے ہیں سب گل
ہے عرق رُخ سے تیرے تیرا شاداب سہرا
مالن نے ہے پرویا کس شان سے یہ سہرا
سہروں میں موتیے کا کیا انتخاب سہرا
سہرا ذرا اُٹھاؤ دیکھیں رُخ منوّر
کیا خوب تو نے رُخ پر ڈالا نقاب سہرا
لائے گا تاب کیونکر کوئی ترے حُسن کی
کردے گا مہر و ماہ میں یہ انقلاب سہرا
آئے گی ہر طرف سے تجھ کو صدا مبارک
توسن پہ جب کہ ہو گا یہ ہمرکاب سہرا
کیا خوب تو نے عابدؔ لکھا ہے آج سہرا
کرتا ہے اور سہروں کو یہ انتخاب سہرا

جب مسٹر فخرالدین سہرا کہہ چکا تو ہر طرف سے نعرہ تحسین بلند ہوا۔ سب نے شاباش کہی فخرالدین آداب کہہ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر ایک رنڈی آن موجود ہوئی۔ تو اس نے آتے ہی نہائت ہی پُر تاثیر لہجہ میں یہ غزل کہنی شروع کی۔ جسے سامعین سنکر جھومنے لگے اور ہر طرف سے واہ واہ کی صدا آنے لگی۔

غزل

کیا بھروسہ میں کروں اس شوخ کی تحریر کا
نہ ہوا سچا کبھی وعدہ بُتِ بے پیر کا

دل میں ٹھانی تھی کہونگا حال دل آیا نہ وہ
فیصلہ اب پڑ گیا تدبیر سے تقدیر کا

باندھنا ہے کیا ضروری جانِ من وقت ذبح
پہلے ہی سے جکڑا ہوں میں گیسوئے زنجیر کا

ہاتھ میں تلوار لے کے سوچتے ہو دل میں کیا
امتحاں مجھ ہی پہ کر لو اے صنم شمشیر کا

آئینہ بھی گر میں دیکھوں پر نظر آتا ہے وہ
دل میں نقشہ جم گیا ہے حسن کی تصویر کا

کب تلک عابدؔ سہیگا ستم تیرے جانِ جاں
ہے نہیں اچھا ستانا عاشق دلگیر کا

اتنا کہہ کر زیب النسا خاموش ہو گئی۔ اور برات کے جانے کی تیاری ہو گئی۔ قریباً پندرہ منٹ میں سب سامان برات تیار ہو گیا اور دولھا میاں گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اور باجے والوں نے باجا بجانا شروع کیا۔ چنانچہ گھوڑا قدم بقدم چلنا شروع ہوا۔ اسی طرح دھوم دھام سے برات لڑکی والوں کے گھر پہنچی۔ اور نہایت ہی اعلیٰ کمرہ میں جو نہایت سجے سجائے تھے۔ ٹھیری۔ جب تمام برات قرینے سے بیٹھ گئی۔ تو مولانا حافظ غلام محی الدین صاحب تشریف لائے۔ اور خطبۂ نکاح پڑھنا شروع کیا قریباً دس منٹ میں ختم ہوا۔ الائچی دانے اور چھوہارے لُٹائے گئے اور ہر طرف سے مبارک "مبارک ہو" کا نعرہ بلند ہونے لگا۔

بعدہٗ کھانے کا دسترخوان بچھایا گیا۔ اور پھر پلاؤ۔ قورما۔ فرنی چٹنی ہر قسم متنجن دہی۔ کوفتے۔ نان۔ ساگ اور مٹھائی مثلاً بالوشاہی۔ برفی وغیرہ وغیرہ تکلف سے

چُن دیئے گئے۔
ایک گھنٹہ تک اس کام سے بھی فراغت ہوگئی اور دولھیاں کو زنانخانے میں بلایا گیا۔ عورتوں میں رسومات آرسی و مصحف کو ادا کیا گیا۔ اور برات کے وداع کرنے کی تیاری ہونے لگی۔
آخر رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آن پہنچا۔ یعنی لڑکی کو ڈولی میں بٹھایا۔ سب رشتہ دار گلے ملے۔ اور رخصت کیا۔ خاصکر مسٹر افتخار احمد اپنی ہمشیرہ کی ڈولی کو کندھوں پر اُٹھا کر چند قدم لیگیا۔ جب برات کچھہ فاصلے پہنچی۔ تو سید حاتم علی نے رو کر محمد سعید خاں صاحب کے آگے ہاتھ باندھے کہ لڑکی کی عزت اب آپ کے دستِ شفقت میں ہے۔
خیر ان سب کاموں سے فراغت پاکر برات روانہ ہوئی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد گھر جا پہنچی۔ دولھن کو نکال کر اوپر سے لے جایا گیا۔ اور اس کمرے میں جا بٹھایا۔ جو خاص دولھن اور دُولھا کے لئے مخصوص تھا۔
آخر خدا خدا کر کے دن گذرا۔ رات آئی۔ مدتوں کے ارمان نکلنے کا وقت آن پہنچا۔ یعنی مسٹر عبدالستار صاحب قریباً دس بجے کمرے میں گیا اور دروازہ بند کیا۔ اور اپنی پیاری معشوقہ (جو کہ اب بیوی ہے) کے پلنگ پر پہلو میں جا بیٹھا۔ اور بلا کر کہنے لگا۔
عبدالستار ۔ آہ میری جان سے عزیز حسن افروز۔ کیا سچ مچ تو میرے پہلو میں ہے۔ یا میں خوابِ غفلت میں ہوں۔
حسن افروز ۔ (شرما کر) میرے پیارے شوہر تم واقعی اپنی حسن افروز کو اپنے پاس دیکھ رہے ہو۔
عبدالستار ۔ آہ میں کیا سچ۔
اتنا کہا اور جھٹ حسن افروز سے لپٹ گیا۔ اور حسن افروز بھی آپے سے باہر ہو کر لپٹی۔ اور دونوں رونے لگے۔ بعد تھوڑے عرصے کے ایک دوسرے کے

آنسو پونچھے۔

عبدالستار۔ پیاری میں کیسا خوش نصیب ہوں۔ کہ میں تمہیں اپنے پہلو میں دیکھ رہا ہوں۔

حسن افروز۔ بے شک میرے پیارے سچ کہا۔ واقعی تم خوش نصیب ہو۔ کہ تم اپنی حسن افروز کو پہلو میں دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ میں تو اپنے ماموں زاد بھائی کی منگیتر ہو چکی تھی یقیناً میری شادی وہیں پر ہوتی۔ اگر میرا خط کھویا نہ جاتا اور یہ معاملہ طشت از بام نہ ہوتا۔

عبدالستار۔ ہاں پیاری ایسی باتوں سے تو خدا کی خدائی ظاہر ہوتی ہے پیاری واللہ مجھے تو امید نہ تھی۔ کہ میں تجھ جیسی گل رعنا کو جس کے گرد کانٹے ہی کانٹے تھے۔ یوں آسانی سے پاؤنگا۔ پیاری اب تو واقعی اپنے آپ کو میں بجنت یا ور خیال کرونگا۔

حسن افروز۔ میرے پیارے بیشک سچ کہا کیا تم سے زیادہ میں خوش نہیں ہوں۔ کہ ایک قلاش عیاش آدمی کی بیوی بننے سے بچی۔ اور بجائے اس کے اپنے پیارے محبوب کی بیوی بنی۔

مسٹر عبدالستار نے جوش اضطراب سے حسن افروز کو گلے سے لگایا اور کہا۔

عبدالستار۔ پیاری میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ مگر خدا کے لئے ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔

حسن افروز۔ پیارے کہو شوق سے کہو تمہاری حسن افروز جو ٹھیک واقعہ ہوگا عرض کرے گی۔

عبدالستار۔ پیاری جب ہم نے تمہارے مکان پر جلسہ کیا تھا۔ اور میں غزل سن کر اضطراب کی حالت میں باہر آگیا تھا۔ اور پھر چوب نواز کے ساتھ اندر جانے لگا تھا تو کیا وہ بازو پکڑ کر مجھے واپس باہر لانے والی تم ہی تھیں۔

حسن افروز۔ ہاں میرے پیارے شوہر بیشک وہ تیری حسن افروز سراپا تقصیر تھی۔

عبدالستار۔ ہائیں افروز کیا سچ۔

حسن افروز۔ ہاں میرے پیارے بالکل سچ۔

عبدالستار۔ نہیں نہیں میں نہ مانونگا۔ تم اور یہ بے باکی۔ نہیں پیاری تم سے ایسا کام سرزد ہونا نہایت ہی بعید ہے۔

حسن افروز۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ سچ عرض کیا ہے۔ وہ تمہاری حسن افروز ہی تھی۔ جو تمہارا ہاتھ پکڑ کر اس کونے میں لے گئی تھی۔

عبدالستار۔ مگر چھری دکھا کر دھمکانا کیا معنی رکھتا تھا۔

حسن افروز۔ میرا قصور معاف ہو پیارے . . . . اس سے مجھے آزمائشِ محبت منظور . . . . رُک گئی۔

عبدالستار۔ ہاں ہاں کہو پھر کیا ہوا۔

حسن افروز۔ مجھے ایسا کرنے سے آزمائش محبت منظور تھی۔ مجھے یہ منظور نہ تھا۔ کہ میں تمہاری جان لوں۔ بلکہ پیارے اگر تم یہ کہتے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔ تو یقیناً میں تم پر اسی کوچے میں تصدق ہو جاتی۔ جب میں نے اچھی طرح سُن لیا۔ کہ تم محبت کرتے ہو تو میری جان میں جان آئی گویا کہ تمہاری اس رات والی مسلسل تقریر نے مجھے دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔

اس میں شک نہیں کہ تم گول سی بات کرتے تھے۔ اور یہ نہ بتاتے تھے۔ کہ تم کس پر عاشق ہو مگر میرے دل نے گواہی دی۔ کہ ضرور یہ بھی تیری محبت کا اثر ہے۔ خیر میں نے کچھ مطلب سمجھ لیا۔ مگر یقین نہ تھا۔ پھر مغنیہ خانم کا خدا بھلا کرے۔ مجھے تمام واقعہ سے اطلاع دی تو مجھے صبر آیا۔

عبدالستار۔ جلوۂ دیدار دکھا کے پھر غائب ہو جانا کیا مصلحت رکھتا تھا۔

حسن افروز۔ پیارے جب میں نے بُرقہ اُتارا۔ تو تمہاری دل لبھانے والی صورت دیکھنے لگی تو اچانک میرے کان میں اُمّی جان کا آواز سنائی دیا۔ جو کہ ماما کو کہہ رہی تھیں کہ جاؤ حسن افروز کو بلاؤ۔ کہ وہ بھی جلسہ دیکھے۔ بس میرے پیارے میں اسی وقت جلدی اور راستے میں ہی ماما کو جا لیا۔

عبدالستار۔ مگر پیاری تمہیں میرے ساتھ محبت کیسے ہو گئی۔ تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا

حسن افروز ۔ پیارے یہ نہیں سنا ۔ کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میری جان حسن افروز اس پہلے ہی دن یعنی جب کہ تم اور نواز ہمارے غریب خانے پر بہائی افتخار سے ملنے آئے تھے ۔ یعنی آپ نیچے بیٹھے تھے ۔ اور میرے ہاتھ سے کنجیوں کا گچھا نیچے گر پڑا تھا ۔ اور میں اس کے دیکھنے کو نیچے جھکی تو تم سے میری آنکھیں دو چار ہوئیں پیارے اُسی دن سے میں گھلانے لگی ۔ بس اُسی دن کی اُلفت ہے ۔ آغاز نے جلسے والے روز اس بے حیائی پر مجبور کیا ۔ ورنہ پیارے یہ حسن افروز بے حیا ۔ بے غیرت نہیں ہے ۔ کہ یوں اس بے شرمی کے کام پر مستعد ہو جاتی ۔

میرے پیارے سچ جانو جس وقت میں یہ کام کر کے کوٹھے پر آئی تو میں اپنے کیے پر پشیمان ہوئی ۔ کہ افسوس میں نے ستم کیا ۔ کہ اس طرح محبت میں بے شرمی کو کام فرمایا ۔ کہ ایک نامحرم سے جا ملی ۔ پیارے میں سراسر قصوروار ہوں ۔ اب لونڈی حاضر ہے ۔ جو چاہو سزا دو ۔ اتنا کہہ کر عبدالستار کے پاؤں پر گر پڑی ۔ اور زار زار رونے لگی ۔ عبدالستار نے آہ پیاری کہہ کر اُٹھایا ۔ اور چھاتی سے لگایا ۔

عبدالستار ۔ میری جان کیا غم ہے ۔ انسان محبت میں گرفتار ہو کر اندھا ہو جاتا ہے سینکڑوں بُرے سے بُرے کام کر گذرتا ہے حضرت عشق دشمن انسان ہیں ۔ یہ اپنے غلام کو اسقدر رسوا کرتا ہے کہ بیچارے کو ناکوں چنے چبواتا ہے ۔ اور یہ اس کے ادنےٰ کرشموں میں سے ایک ہے ۔ جو تم نے کیا ہے ۔ پیاری غم نہ کھا کیا ہوا ۔

حسن افروز ۔ نہیں نہیں پیارے ۔ تم ضرور میری یہ غلطی معاف کرو ۔ للہ معاف کرو ۔

عبدالستار ۔ میری جان کیوں غم کرتی ہو ۔ اس میں معافی کیسی ؟

حسن افروز ۔ یہی کہ ایک زبردست قصور مجھ لونڈی سے سرزد ہو چکا ہے ۔ پیارے میں ضرور معافی لے کر چھوڑونگی ۔ خدا کے لئے میرا قصور معاف کرو ۔ میری ہی خاطر کہو کہ اے حسن افروز جا میں نے تیرا قصور معاف کیا ۔

عبدالستار ۔ اچھا میری جان میں نے تمہارا قصور معاف کیا ۔

اتنا لفظ سُنتے ہی حسن افروز خوش ہو گئی اور پھر خود لپٹی ۔

عبدالستار۔ پیاری افروز میں نے تم کو ایک مرحوم کا پیغام دینا ہے۔
حسن افروز۔ کس کا۔
عبدالستار۔ عبدالواحد کا۔
حسن افروز۔ آہیں عبدالواحد کا۔۔۔۔ (حیران ہو گئی۔ وہ تمام واقعہ آنکھوں کے آگے پھرنے لگا۔ کہ رات کو عبدالواحد کا اُٹھا لے جانا اور مصیبت میں مبتلا کرنا) خدا کے لئے مجھے اس کا نام نہ بتاؤ۔ مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔
عبدالستار۔ اور تو کچھ نہیں صرف یہ کہنا ہے کہ وہ مرتی دفعہ مجھے یہ کہہ گیا تھا۔ کہ حسن افروز کو کہنا کہ میرا قصور معاف کر دے۔ کہ میں نے اُسکو بہت پریشان کیا تھا
حسن افروز۔ آہ اگر وہ زندہ ہوتا تو کبھی معاف نہ کرتی۔ مگر چونکہ مر چکا ہے۔ اسلئے صدق دل سے معاف کیا۔
عبدالستار۔ بھلا وہ واقعہ تو مجھے بھی سناؤ۔
حسن افروز۔ پیارے رنج دیتا ہے۔
عبدالستار۔ نہیں پیارے سنانا پڑے گا۔

حسن افروز نے تمام واقعہ عبدالواحد کا اُٹھا لیجانا۔ ہاتھ پاؤں کا باندھنا۔ اور ایک جوان کا بوسے کے لئے آگے بڑھنا۔ اُسکو باندھے ہوئے ہاتھوں سے مارنا۔ جس سے آنکھ کا پھوٹ جانا۔ پھر مستری ہن کا جاگنا۔ دروازے میں کھڑا ہونا۔ اسکو ڈنڈے سے مار کر بیہوش کرنا۔ پھر بھاگنا۔ مگر دروازے کے بند رہنے سے ناکام رہنا۔ پھر جاکے ہمت سے چابی نکالنا۔ پھر تالہ کھولنا۔ اور گرنا۔ کانے جوان کا اُسکو پکڑنا۔ اور اُس کا جلدی سے اُٹھکر دروازے کا بند کرنا۔ پھر بازار میں آنا۔ راستہ نہ آنا۔ پھر اُن (ستار نواز۔ فخر) تینوں کا آنا۔ اپنا اُن کے پیچھے پیچھے گھر پہنچنا۔ آگے اچانک اس کے والد بزرگوار کا آنا۔ دروازہ کھلنا وغیرہ وغیرہ کہہ سنایا۔ کہ جس سے ستار حیران ہو گیا۔
عبدالستار۔ آہ میری پیاری وہ تم ہی مصیبت زدہ تھیں۔ جو ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔

حسن افروز۔ ہاں پیارے وہ میں ہی تھی۔ جو رضائی اوڑھے تھی۔ میں نے تمام باتیں تمہاری محبت آمیز سن لی تھیں۔ جس سے اتنا تو ہوا۔ کہ تم میری طرح عاشق صادق ہو۔
عبدالستار۔ آہ میری پیاری تم پر عبدالواحد کا وار چل گیا۔ وار بھی میری خاطر اُف اُف اُف۔

اتنا کہہ کر حسن افروز سے لپٹ گیا۔ اور دیر تک اپنی معشوقہ سے چمٹا گیا۔
اب چونکہ رات زیادہ آچکی تھی۔ اس لئے اب دونوں کے دل امنگوں سے لبریز تھے۔ اب مناسب نہیں۔ کہ اپنے ہردو ہیروین کے پاس توقف کریں۔ چلئے اب چلیں۔

خدایا جیسے تو نے ان طالب و مطلوب کے دن پھیرے ہیں۔ اسی طرح ہر طالب و مطلوب کے دل کی امیدیں برلا۔ آمین ثم آمین۔
اچھا ناظرین رخصت اگر زندگی نے وفا کی۔ تو پھر کسی اور رنگ میں انٹروڈیوس کریں گے۔ رخصت۔ رخصت۔ رخصت

سنسنی خیز تازہ ناول
بیگناہ قیدی مکمل
اضطراب
ڈاکوؤں کا جنگ
بہرام کی فراری
وفادار محبوبہ
طلسمی کل
نیلی چھتری جلد ۲
دلاور فیروزہ
نیا شگوفہ
جانباز عورت
خونریز جنگ
ملک العزیز ورجنا
قتل بیگناہ مکمل
عجیب انقلاب
حسن بن صباح
انسپکٹر معصوم علی
خار حسرت
دوزخ کی ملکہ
مس جین
خونی ڈاکو
منگوانیکا پتہ:- فضل بک ڈپو فضل منزل ۲۷ لاہور